میں سے صرف دو پر پتا ،
ہے۔ اور دو والوں
رام پور کے نام ہے، جس کو

ٹکٹ

رام پور آزا
محمد حسین خا

دوسرا جنوری بربادی کو
صفحہ ۱۱۲ کے مقابل شا

یہ ملی جامع مسجد کے پاس
بکینگ بیرنگ ۱۲ مارچ

اس سے یہ نتیجہ نکلتا
احباب اور شاگردوں کو

ٹکٹ

میرزا صاحب بیشتر جو
میں "پیڈ" پوسٹ پیڈ"، ا
پیڈ مزدوری واجب العرض،
مزدوری۔ یا پیڈ واجب العرض
لفافے پر ٹکٹ لگانے
پر اور کبھی پشت پر، اور
کبھی وسط میں نیچے کی طرف

چسپاں کرتے تھے۔

میرزا صاحب نے ایک دو چھوڑ کر باقی ہر ٹکٹ پہ اپنا تخلص "اسدؔ یا غالب" اور اگر دو ٹکٹ ہوے، تو پہلے پر اسدؔ اور دوسرے پر غالب ضرور لکھا ہے۔ ایک دو پر اسد اللہ بھی ہے۔ غالباً اس سے مقصود یہ تھا کہ دوسرا شخص اس ٹکٹ کو استعمال نہ کر سکے۔ لیکن قدر بلگرامی کو ایک خط میں بھی لکھا ہے کہ

"دیپا ل بھی ٹکٹ پر تحریر کی ممانعت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ طرفین سے خطوط بیرنگ پہنچے جائیں کہ یہ قصہ مٹ جائے"[۱]

یہ خط مرتب خطوط غالب کے نزدیک جون ۶۲ء اور فروری ۶۳ء کے درمیان کسی تاریخ کو لکھا گیا تھا۔ اگر میرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ٹکٹ پر نام لکھنا ممنوع ہے، تو وہ اپنے اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء تک کے رام پور بھیجے ہوے لفافوں پر دستخطی ٹکٹ چسپاں کرتے رہے ہیں۔

ان ٹکٹوں پر ڈاک خانے کی جو مہر لگائی گئی ہے، اس پر ۵ نومبر سنہ ۵۹ء تک انگریزی میں "۴۷" اور ۱۳ جولائی سنہ ۶۰ء سے "۷۶" لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مہر اور ثبت ہے، جس پر انگریزی میں دلی (DELHIE) منقوش ہے۔ ۱۷ اپریل سنہ ۶۱ء کے لفافے سے ڈاک خانے والوں نے سرخ روشنائی سے انگریزی میں رامپور بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس لفافے سے دہلی کی مہر کے ساتھ ایک مہر میرٹھ کی بھی شروع ہوئی ہے۔ اس میں اوپر میرٹھ، درمیان میں تاریخ اور نیچے سورٹڈ (SORTED) منقوش ہوتا ہے۔ ۵ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء سے مرادآباد کی مہر بھی چسپاں نظر آتی ہے۔

۱۔ خطوط غالب: ۱: ۱۹۳۔

روشنائی

میرزا صاحب ہمیشہ سیاہ روشنائی استعمال کرتے تھے، جو عموماً روشن اور پختہ ہوتی۔ آخری ایام کے خطوط میں پھیکی روشنائی بھی نظر آتی ہے، جس کی وجہ خود میرزا صاحب کی قلمدان سے بے توجہی تھی۔ ضرورت کے وقت لڑکوں کے قلم اور انھیں کی روشنائی سے لکھا کرتے ہوں گے اور خود لوح و قلم کی درستی اور اہتمام سے اس لیے بے پروا ہو گئے ہوں گے کہ اب انھیں ان دونوں کی شہادت کی ضرورت باقی نہ تھی، عالم ادب اُن کا لوہا مان چکا تھا۔

قواعد ڈاک کی پابندی

میرزا صاحب ڈاک کے قاعدوں کے سخت پابند تھے۔ وہ خود بھی خلاف ورزی قانون سے احتراز کرتے، اور احباب کو بھی اسی امر کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ایک بار زکا کو لکھا ہے۔

"خط میں خط ملفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں اُن کے نام کا خط تمھارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔"[1]

منشی غلام بسم اللہ نے اپنی غزل کے ساتھ کسی مزمن صاحب کی غزل بھی ارسال کر دی تھی۔ اُن کی اس سہل انگاری پر سرزنش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دیکھیے۔ حضرت، خط میں خط رکھا، تداخل بُرا ہے۔ اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا، تو مجھ سے پچاس روپیہ لیے جائیں گے یا قید کا حکم ہوگا۔ آیندہ آپ خط جدا گانہ بھیجا کیجیے۔ اس باب میں تاکید جانیے۔ کوئی حیلہ جواز کا آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔"[2]

سرور نے پارسل میں کچھ خط رکھ دیے تھے۔ اُن کو تحریر کرتے ہیں:

۱۔ عود ۲: ۱۸۲ (۲) اردوئے: ۱۴۳۔

"پارسل میں خطوط بھیجنے محلِ اندیشہ ہے۔ خدا نے بچا یا۔ چونکہ اب وہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا اور راہِ احتیاط پارسل بھیجا سے نکال لیے ہے۔"[۱]

ایک بار تفتہ کے نام ایک پارسل حسبِ قاعدہ ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کر کے ڈاک خانے بھیجا۔ جو شخص پارسل لے کر گیا تھا، اس نے غلطی سے خطوں کے بکس میں پارسل ڈال دیا۔ میرزا صاحب نے واقعے سے مطلع ہو کر تفتہ کو لکھا:

"صاحب، کل پارسل شمار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پر یہ لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیجا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمتگار نا خواندہ آدمی، اس حکم کو بجا لایا، اور اس کو خطوں کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ "یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے" دستاویز معقول ہے اگر وہاں کے ڈاکیے تم سے خط کا محصول مانگیں، تو تم اس جملے کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔"[۲]

دراصل میرزا صاحب کی احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار تفتہ کی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے، اور غالباً پارسل کو خطوں کے بکس میں ڈال دینے کی وجہ سے ان کو پوسٹ پیڈ پارسل کا مزید محصول ادا کرنا پڑا تھا۔ ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء کو یہ واقعہ خود تفتہ کو لکھا ہے۔

"میرزا تفتہ، کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹتا ہے، آیا اور اس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا! بارے جب اس کی تحریر دیکھی، تو تمہارے ہاتھ کا ہم فلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۱۳۷ - (۲) ایضاً: ۱۰۹

ہوئے۔ مگر اس کے آگے کالی مہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلوا دیجئے۔ دلوا دیے اور پارسل لے لیا۔ مگر حیران کہ یہ کیا ہیچ پڑا۔ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمہارا آدمی جو ڈاک گھر گیا، اس کو خطوں کے بکس میں ڈال آیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی، اور اس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔"[1]

لطیفہ

ایک بار میرزا صاحب کے نام خط آیا۔ چونکہ ہیں مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ جو تعظیمی الفاظ تھے، ان میں ایک لفظ "کپتان" بھی تھا ڈاکیے نے اسے "کپتان" پڑھا، اور میرزا صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کی۔ میرزا صاحب نے شفق کو یہ واقعہ لکھا ہے: فرماتے ہیں:

"ایک لطیفہ سنا انگیز سنیئے۔ ڈاک کا ہرکارہ، جو بلیماروں کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں ایک بنیا پڑھا لکھا کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے۔ میں بالاخانے پر رہتا ہوں، حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دیا، اور اس نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو، جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے: سرنامہ کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشان" لکھا تھا اس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشان" کو "کپتان" پڑھا ہے۔"[2]

۱۔ اردوی: ۵۵ ۲۔ ایضا: ۳۰۰۔

بیرنگ خطوط

بیرنگ خطوط ارسال کرنے کو میرزا صاحب قانونِ محبت و اخلاق کے خلاف جانتے تھے۔ سید احمد حسن مودودی کو ایک بیرنگ خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا شیوہ نہیں ہے خط بیرنگ بھیجنا" (۱)

لیکن کبھی بیرنگ خط بھیجتے، تو بیرنگی کی وجہ بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اُن کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱) یا تو اُس وقت بیرنگ خط لکھا کرتے، جب اُن کے پاس ٹکٹ موجود نہ ہوتا، خواہ اس لیے کہ جیب اس کی اجازت نہ دیتی، یا بروقت ڈاک خانے سے ٹکٹ کا حصول دشوار ہوتا۔ مگر اس عذر کے لیے بے تکلف احباب اور شاگرد مخصوص تھے۔ مجروح کو ایک بیرنگ خط میں لکھا ہے:

"بھائی، نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک سادہ بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگا لوں گا۔" ۲

اسی طرح علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی، سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں، تو کہاں رہا نذہ، اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟" ۳

ثاقب کو زیادہ مضحکانہ انداز میں تحریر کیا ہے:

"آج میرے پاس ٹکٹ ہے، نہ دام، معاف رکھنا، والسلام" ۴

۲) یا اس وقت بیرنگ ارسال کرتے جب خط کے تلف ہو جانے

(۱) اردوئے معلیٰ ۲۴۴ (۲) ایضاً: ۱۵۵ (۳) ایضاً: ۲۴۵ (۴) ایضاً: ۲۹۱۔

کا خطرہ ہو[۳]۔ چونکہ تلف ہو جانے کا خطرہ بیرنگ مکاتیب کے معاملے میں زیادہ ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے، اور اہم مکاتیب بے ٹکٹ اور باٹکٹ دونوں قسم کے مکتوب الیہ کو لکھے جاتے ہیں۔ بنا بریں اس عنوان کے ماتحت میرزا صاحب نے والیان ریاست اور امرا کو جو بیرنگ خطوط لکھے ہیں (۱) ایک بار شفق نے ... لکھنے کی شکایت کی تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

"میں سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ تھے تلف ہونا ان کا متصور نہیں"[۲]

دراصل میرزا صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ڈاکیہ بیرنگ خط کوشش کرکے مکتوب الیہ تک جا پہنچا دیتا ہے، تاکہ اس سے محصول ڈاک وصول کر سکے۔ یہ خیال ۳ مارچ ۱۸۵۹ء کے شفق کے خط میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بانی اور بانی میں ہوا ہوں۔ آپ بھی جب کبھی امر ضروری خط بھیجیے، تو بیرنگ بھیجیے"[۳]

یہی رائے سید احمد حسن مودودی کے خط میں بھی ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ خط عمداً بیرنگ بھیجتا ہوں، کیونکہ کہ بیرنگ کے تلف ہونے کا احتمال ہے اور بیرنگ کا نہیں"[۴]

سیاح کو لکھتے ہیں

"پیڈ خط کا تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر یہ خط تم کو

---

(۱) نواب فردوس مکان کے نام دوسرا خط، جس میں قصیدہ منسلک تھا، بیرنگ بھیجا تھا

(۲) اردوئے معلیٰ: ۳۰۴، ۳۰۳، خطوط: ۱/ ۱۴۱، ۱۴۲ اردوی: ۴۴۳۔

بیرنگ بھیجتا ہوں، تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے"۱

سرور کو ضرور (۱) خطوط کے بیرنگ ارسال کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجیے گا، تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا، اور رجسٹری کا درد سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی، ایک آنہ سہی، آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجیے، اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ اسٹامپ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں واضح ہوا ہوں، باعث بھی ہوا، اور یہ خط بیرنگ بھیجا"(۲)

مولوی عزیز الدین نے، جنون بریلوی کے خط ارسال کرنے کی اطلاع دے کر اس کا جواب نہ لکھنے کی شکایت کی (۳)، جواب میں میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"خط از روی احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ پوسٹ پڑ خط اکثر تلف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، آنکھیں پھوٹ جائیں، اگر میں نے دیکھا ہو! آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے، اور خط کے نہ پہنچنے کی اُن کو خبر پہنچا دیجیے"۔

والیِ کھیرپور کا انتقال ہوا اور یہ خبر دلی پہنچی، تو میرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ کہیں جانی جی، جو میرزا تفتہ کے مربی تھے، معزول تو نہیں کر دیے گئے۔ اس خبر کے استفسار کے لیے تفتہ کو خط لکھا اور اس میں تاکید کی کہ:

"و: سطے خدا کے! نہ مختصر نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہوا ہو، اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو، اور جلد لکھو، کہ مجھ پر خواب و خور

(۱) اردوی: ۱۴ (۲) عود ہندی: ۲۳ (۳) اردوی: ۲۱۷

حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا، آج صبح قطعے نہیں گیا، اور یہ خط لکھ کر ازراہ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں، اور پوسٹ پڑ پڑا رہتا ہے۔ جب اس محلے میں جانا ہوتا ہے، تو اس کو بھی لیجاتے ہیں"۔(۱)

دستنبو کی طباعت کے متعلق ضروری ہدایات بیرنگ لکھ کر فرماتے ہیں:

"واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا"۔(۲)

اسی طرح تفتہ کو ایک ضروری خط بیرنگ لکھ کر عذر کرتے ہیں:

"بھائی یہ خط ازراہ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں"۔(۳)

نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ایک عریضہ جو اُن کی والدہ ماجدہ کی تعزیتِ وفات کے متعلق تھا، ارسال کیا ہے، اور اس کا جواب نہ پا کر دوسرا عریضہ بیرنگ ارسال کرتے ہوئے آخر میں ازراہِ معذرت لکھتے ہیں:

"پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحبہ و قبلہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے یقین ہے کہ پہنچے گا۔ ازراہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ کرتا ہوں"۔(۴)

میرزا صاحب پوسٹ پیڈ خط کے ضائع ہو جانے کے اس درجہ قائل تھے کہ جب کبھی اُنھیں کوئی خط نہ ملتا، وہ اُسے ڈاک خانے کی سہل انگاری پر محمول کر کے لکھ دیا کرتے کہ ڈاک میں ضائع ہو گیا ہو گا، اور اگر کسی دوست سے جواب خط میں تاخیر ہوتی، یا اُن کے مرسلہ خط کا حوالہ نہ ہوتا، تو باور کر لیتے کہ خط ڈاک میں تلف ہو گیا۔

---

(۱) اردوی: ۱۴۱ (۲) ایضاً: ۸۰ (۳) ایضاً: ۳۴ و ۳۵ (۴) مکاتیب: ۱۴

میرزا صاحب کا پتا

اگرچہ باعتبار حسب و نسب میرزا صاحب دلّی کے مشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن اُن کی وسیع اور مسلسل مراسلت نے اس شہرت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اُن کے پاس روزانہ ہندوستان اور بیرون ہند سے اردو، فارسی اور انگریزی خطوط آتے رہتے، جن میں سرکاری اور نجی ہر قسم کی تحریریں ہوتی تھیں۔ چونکہ شہر میں انھیں ہر شخص جانتا تھا، اس لیے اُن کا خیال یہ تھا کہ دلّی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر میرے نام کا خط کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اُن کی ڈاک خانے کی معروفیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پورے شہرِ دہلی میں وہ اپنے نام کے اعتبار سے یکہ و تنہا تھے اور ڈاکیا اسداللہ خاں غالب کا مسمّیٰ ایک ہی ذات کو جانتا تھا۔

میرزا صاحب کو اپنی اس شہرت و ناموری کا اس درجے پاس تھا، کہ کوئی دوست یا شاگرد اُن کے مکان کا پتا دریافت کرتا، یا اُن کے نام کے خط پر لانبا چوڑا پتا لکھ دیتا، تو وہ اس کو اپنی توہین خیال کرتے۔ ایک بار علائی نے مکان کا پتا دریافت کیا۔ میرزا صاحب نے برہم ہو کر لکھا:

> دوست صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں یہ حالی تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے، اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو، اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی

یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام یہ سب مراتب تم جانتے ہو، اور اُن خطوں کو تم دیکھ چکے ہو، اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن ہوں۔"[1]

جنون بریلوی نے پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے خط لکھنے میں تردد کا اظہار کیا۔ اُن کو لکھتے ہیں:

"قبلہ، آپ کو خط کے بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی، اور ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر ہمارا آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے رہے، اور مجھ کو بلی ماروں میں خط پہنچتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا۔"[2]

ذکا نے یکے بعد دیگرے دو نیاز نامے بھیجے، مگر مرزا صاحب کی طرف سے جواب نہ ملا۔ انھوں نے اس کو دلی کے ڈاک خانے کی غفلت پر محمول کر کے آخری خط بذریعہ رجسٹری ارسال کیا، اور اس میں جواب نہ دینے کی شکایت لکھی۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب الفاظ و مطالب کے گل کھلاتے ہیں:

"میرے مشفق، میرے شفیق، مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے، مجھ سے برے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے

---

(۱) اردوئے معلی: ۱۸۴ (۲) ایضاً: ۲۰۷۔

محبوبا! تم کو میری کچھ خبر بھی ہے؟ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔
آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد
ہے، رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی
ہوگئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔
اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں کی اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط
تمھارا پہنچا . . . . . دوسرا خط مع غزل آیا . . . . . غزل بعد مشاہدہ
تم کو بھیج دی گئی۔ اور لکھا گیا، نویدِ حصولِ صحت جلد بھیجو۔ کل ایک خط رجسٹری
دار آیا۔ گویا ستارۂ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے! بارے
کھولا اور دیکھا۔ خط نویدِ رفعِ مرض و حصولِ صحت سے خالی اور
شکوہ ہای بیجا سے لبریز۔

صاحب! میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو
رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا مجال ہے کہ مجھ
تک نہ پہنچے! اسی طرح میرا خط یہاں کے ڈاک خانے سے نہ روانہ
ہو، کیا معنے! جہاں پہنچے، وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں
کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔"[۱]

تفتہ کو ایک خط میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ نامور آدمی کے واسطے
محلے کا پتا ضرور نہیں۔ فرماتے ہیں:

دربات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضرور نہیں۔ میں
غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے
ہیں، "محلہ" نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر نام محلے کا نہیں ہوتا، اور
انگریزی خط پر تو مطلق لکھا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے، چنانچہ
خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا کہ

(۱) اردوی: ۷: ۳

بلّی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے"[1]

مہر کو تحریر کیا ہے:

"اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے، کہ میرے خط کے سرنامے پر محلے کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، قصہ تمام"[2]

ایک بار میرزا صاحب نے مکان تبدیل کیا۔ تفتہ کو تردد ہوا کہ یہ مکان کس محلے میں واقع ہے۔ ان کے اس تردد کے رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے:

"یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہشت ہے، اور یہ جو بلی کہ محلہ وہی بلیماروں کا۔ اگرچہ یوں کہیں اگر اور محلے میں بھی جا رہتا، تو قاصد ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط لال کنوے کے پتے سے آتے ہیں، اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہر حال تم دہلی "دلّی بلیماروں کا محلہ" لکھ کر خط بھیجا کرو"[3]

"تفتہ ہی کو دوبارہ لکھا تھا:

"میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے، اس پر کیا بجوگ پڑا"[4]

سید احمد حسن مودودی کی شکایت پر تحریر کیا ہے:

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اُسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک میں پہنچکر کیا امکان ہے کہ تلف ہو"[5]

ایک بار میرزا صاحب نے میر مہدی مجروح کے نام خط لکھا۔ ڈاکیے نے غلطی سے کسی دوسرے میر مہدی کو جا دیا۔ انھوں نے میرزا صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر ارشاد ہوتا ہے:

---

(۱) اردوی ۱۷۸ (۲) ایضاً: ۱۲۵ (۳) ایضاً ۷۵ (۴) ایضاً ۸۲ (۵) ایضاً ۲۲۵۔

" وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہمنام کے ہاتھ جا پڑا،
صاحب تصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں
دوسرا میر مہدی بھی؟ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں
نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم، عرف بننے دیا، نہ
اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔"(۱)

ابتدائی مراسلت میں نواب فردوس مکاں کے فرامین جامع مسجد کے پتے سے جاتے تھے، حالانکہ میرزا صاحب ساٹھ آٹھ برس سے بلیماروں میں چلے آ رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ فرامین میرزا صاحب کو ملتے رہے جب خود انھوں نے سرکار کو لکھا کہ:

" وبیرزانِ خاص برعنوانِ نامہ ہای بیشیں نشان کلبۂ ایں دردیش دلریش
عقب مسجد جامع بنشتہ اند و من از ہفت ہشت سال در محلۂ بلیماران
می مانم۔ سپس نشانِ ایں محلہ نگاشتہ شود۔"(۲)

اور اس پر سرکار نے اہلِ دفتر کو ہدایت فرمائی، تو یہاں سے خط بلیماروں کے پتے لکھے جانا شروع ہوئے۔

۱۔ اردوئی: ۹۸ (۲) مکاتیب ۱۰۶

متعلقاتِ انشا

اس بحث کے آخر میں بعض ایسے حالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو بظاہر میرزا صاحب کے عادات و خصائل کی ایک کڑی معلوم ہوتے ہیں، لیکن اُن کی انشا کی کیفیت و کمیت کے اندازے کے لیے ان کا مطالعہ افادے سے خالی نہیں، اور اس لیے انھیں متعلقاتِ انشا کے عنوان سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

جواب میں جلدی

خطوط کا جواب دینے میں میرزا صاحب بہت باضابطہ تھے۔ وہ یوں تو ہر خط کا جواب فوراً لکھتے؛ اور غیر اختیاری عذر کے علاوہ کسی اور عذر کے پیش کرنے کا کبھی موقع نہ آنے دیتے، لیکن ضروری اور جواب طلب خط کے جواب میں بے حد جلد بازی سے کام لیتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ یہ جانتے ہوئے کہ اب ڈاک کا وقت گزر چکا ہے، جواب لکھ لیتے اور مکتوب الیہ کو بتا دیتے کہ اس مجبوری کے سبب آج خط سپردِ ڈاک نہ ہو سکا۔ مثلاً تجبر کو تحریر کیا ہے:

در جنابِ عالی، آج دوشنبہ ۳ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہو گا...... عمزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا...... با آنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا"۔[1]

شفق کو لکھا ہے:

"خداوندِ نعمت، آج دوشنبہ ۲ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے

---

[1] ار اردو: ۲۷۵

اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا۔ اُدھر پڑھا، اِدھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو معنون کر رکھتا ہوں۔ کل شنبہ ۱۶ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔"(۱)

علائی کو لکھتے ہیں:

"آج یوم الخمیس ۱۹ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا، اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔"(۲)

ایک بار مجروح کا خط صبح کی ڈاک سے موصول ہوا۔ میرزا صاحب نے اس کا فوراً جواب لکھا اور اس میں تحریر کیا:

"آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں، نیر بدلی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔"(۳)

انھیں کو لکھتے ہیں:

"اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزا ملا، تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔"(۴)

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"آج سنیچر کو دو پہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا، اور جواب لکھا، اور کلیان کو دیا وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔"(۵)

معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک ڈاک کا ہرکارہ تقسیم و جمع خطوط دونوں کام کیا کرتا تھا۔ میرزا صاحب نے تفتہ کے خط میں لکھا ہے:

"اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے

(۱) اردوئے معلی: ۵۹ (۲) ایضاً: ۱۱۲ (۳) ایضاً: ۱۸۰ (۴) ایضاً: ۱۹۳ (۵) ایضاً: ۸۰۔

ہرکارے کو دیا گیا۔"۱

عذرِ تاخیر

چونکہ میرزا صاحب خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، اس لیے اگر ان کا کوئی دوست اپنے نیاز نامے کا جواب نہ پانے کی شکایت لکھتا، اور فی الحقیقت کسی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو جاتی، تو میرزا صاحب فوراً عذرِ تاخیر لکھ دیتے، لیکن اگر شکایت بے بنیاد ہوتی، تو اپنے اوپر کبھی ذمہ داری نہ لیتے اور صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار میر احمد حسن مودودی نے شکایت کی کہ آپ نے میرے کئی خطوں کا جواب نہیں بھیجا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمے باقی نہیں ہے۔ دو باتیں: جس خط کا جواب نہیں پہنچا، (۲) کو یہ سمجھیے کہ وہ خط راہ میں تلف ہوئے" اور میرے پاس نہیں پہنچے۔"۲

ایک بار اپنی عادت کے خلاف تفتہ کے خط کا جواب دوسرے دن لکھا، تو تاخیر کی تلخی کو ظرافت کی چاشنی سے بدلنے کی بھی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:

"بندہ پرور، آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا، کتنا شتاب لکھتا ہوں۔"۳

اسی طرح مجروح کے خط کے جواب میں کئی دن کی دیر ہو گئی، تو انھیں لکھا:

"واہ سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بسبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔"۴

۱۔ اردوی: ۸۰ (۲) ایضاً: ۲۴۰؛ (۳) ایضاً: ۲۶۸ (۴) ایضاً: ۱۷۴

ایک بار قہر کو خط لکھا، اور بکس میں رکھ لیا کئی دن کے بعد بکس کھولا تو خط برآمد ہوا۔ اس کے متعلق انھیں تحریر فرماتے ہیں:

مرا بسادہ دلیہای من تواں بخشید ۔۔۔ خطا نمودہ ام وچشم آفریں دارم

کل دوشنبے کا دن ۳۰ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا، اور بیرنگ ڈاک میں بھیجدیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمہارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا، کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ نکالنے لگا۔ بکس میں سے وہ تمہارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں، اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو"۱

ایک مرتبہ میرزا صاحب نے تفتہ کو خط لکھا۔ ان کی طرف سے جواب نہ ملا۔ بلکہ خط آیا تو الٹی خط نہ بھیجنے کی شکایت درج تھی۔ میرزا صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آج پنجشنبے کے دن ۱۸ نومبر کو تمہارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمہارا خط پہنچتا ہے، اور میرا خط نہیں پہنچتا"۲

لیٹے لیٹے لکھتے

میرزا صاحب شدتِ مرض اور زیادتی ضعف کے باعث نشست و برخاست کی قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی جواب خط سے دوستوں کو محروم رکھنا گوارا نہ کرتے، اور لیٹے لیٹے جواب لکھتے تھے۔ ایکبار فرزدی

۱۔ اردوی: ۵۵، ۲۲، ایضاً: ۷۱۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں تپ و لرزہ کا شدید دورہ ہوا۔ ابھی مرض کی شدت باقی تھی کہ تفتہ کا خط آگیا۔ میرزا صاحب نے اسی حالت ضعف میں جواب دیا، اور اس میں لکھا:

"میں چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں۔۔۔۔۔۔ اتنی سطریں مجھ سے بہزار جرِ ثقیل لکھی گئیں۔"[۱]

صاحبِ عالم مارہروی کو بحالت بیماری لکھا ہے:

"جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ بھی اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔"[۲]

اسی طرح ایک مرتبہ مجروح کا خط آیا، تو میرزا صاحب کو اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ اسی حالت میں جواب لکھ کر آخر میں فرمایا:

"بارہ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا، اور اسی طرح جواب لکھا۔"[۳]

سنہ ۱۸۶۲ء میں تقریباً سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا، اور بالخصوص سیدھے ہاتھ کے پھوڑے کی تکلیف سے روح تحلیل ہوئی جاتی تھی۔ اس حالت میں بھی خطوں کے جوابات برابر بھیجتے رہے۔ سرور کو لکھتے ہیں:

"اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف۔ خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے، اور ایک خط شاہ عالم صاحب کا اور دو خط حضرت صاحب کے آئے، جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو طعنے دے کر مرد بنایا، جب یہ عبارت لکھی۔"[۴]

انھیں کے ایک خط میں اشعار کے حسن و قبح کا معیار بتاتے ہوئے آتش و ناسخ کا ذکر کرتے ہیں۔ استشہاد میں اُن کا کوئی شعر نہیں آتا، تو کہتے ہیں:

۱۔ اردوی: ۷۵ (۲) ایضاً: ۳۰۲ (۳) عود: ۱۵۴ (۴) اردوی: ۱۵۱۔

یاد کیا آوے۔ لیٹا ہوا ہوں۔ دمبدم پانو کے ورم کی ہیں ہوش اُڑائے دیتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"[۱]

اسی زمانے میں تفتہ کو لکھا ہے:

"میں ناتوان بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔"[۲]

ضعف کے سبب مراسلت میں کمی

جب بوجہ پیرانہ سالی میرزا صاحب کا ضعف روز افزوں ہونے لگا، تو مجبوراً مراسلت میں کمی کرنی پڑی۔ تاہم اس حالت میں یہ کبھی نہ ہوا کہ کسی جواب طلب خط کا جواب نہ دیا ہو۔ ہاتھ میں رعشہ اور بینائی میں نقصان آجانے کے بعد اخبارات میں اپنی اس حالت کا اعلان کر کے ارباب ادب سے التجا کی تھی کہ آئندہ جواب خط اور اصلاح اشعار سے معاف رکھا جائے۔ اس پر بھی برابر خطوط چلے آتے تھے۔ میرزا صاحب کسی بے تکلف دوست کے منتظر رہتے ـــــ جب ایسا دوست آجاتا، اس سے جواب لکھا دیتے۔ ایک بار رضوان نے کوتاہ قلمی کی شکایت کی۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مرزا رسم تحریر خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں، بلکہ متروک ہوں۔ . . . . . اگر تمہارے خط کا جواب نہ لکھوں، تو محل ترحم ہے، نہ مقام شکایت۔"[۳]

اپریل سنہ ۱۸۶۹ء میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا رعشہ پیدا ہو گیا، بینائی میں بڑا فتور پڑا، حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۱۰۵ (۲) ایضاً: ۷۹ (۳) ایضاً: ۳۲۱۔

ہو سکا، احباب کی خدمت بجا لایا، اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سنی کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اشعار مجھ پر معاف کر دیں خطوط شوقیہ کا جواب جب صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔ زیادہ حد ادب ''۱

ذکا نے کیفیتِ مزاج دریافت کی، تو اُسے پُر درفشانی فرماتے ہیں:

''تم میری بات پوچھتے ہو، مگر میں کیا لکھوں! ہاتھ میں رعشہ، انگلیاں کہنے میں نہیں، ایک آنکھ کی بینائی زائل جب کوئی دوست آجاتا ہے، تو اُس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں''۲

جون سنہ ۱۸۶۷ء میں بہاحَ کو اپنی حالت لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا''۳

اُنھیں کو اگست ۶۷ء میں لکھا ہے:

''آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں رعشہ آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے، تو اُس سے جواب لکھوا لیتا ہوں۔ بھائی، میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں؟ ہاں اکمل الاخبار اور شرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں، اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو اُن کے اخبار

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۳۹۴ (۲) ایضاً: ۴۰۰ (۳) ایضاً: ۳۳

میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے، اور اس میں میں نے عذر چاہا
خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے
عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور
اشعار اصلاحوں کے چلے آتے ہیں، اور میں شرمندہ ہوتا ہوں،
بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔"(۱)

نواب میر غلام بابا خاں بہادر نے کبھی کبھی اطلاع خیریت کی خواہش کی تھی، انھیں ۷ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"آپ جو فرماتے ہیں، کہ تو اپنی خیر و عافیت کبھی کبھی لکھا کر۔ آگے اتنی طاقت
باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی، ہاتھ
میں رعشہ پیدا ہوگیا، بینائی ضعیف ہوگئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا
مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت
پر آگئے، تو جو مطلب کہتا گیا، وہ لکھتے گئے۔"(۲)

سید احمد حسن مودودی کو کسی دوست نے اطلاع دی کہ اب مرزا صاحب کو افاقہ ہے۔ انھوں نے مرزا صاحب سے اس کی تصدیق چاہی۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

"جو آپ نے سنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقت ہے،
سو محض غلط ہے۔ آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں، خط نہیں لکھ سکتا
ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں
وہ غریب لکھتا گیا ہے"(۳)

اپنی اس مجبوری کے زمانے میں مرزا صاحب دوستوں اور شاگردوں
کے خطوط کی طرح اعزہ کے خطوط کا جواب بھی بمشکل دیا کرتے تھے۔
عارف کے بڑے بیٹے باقر علی خاں کامل، جنھیں بیٹوں کی طرح پالا تھا، روزگار

۱۔ اردوی: ۲۰ (۲) ایضاً: ۸ (۳) ایضاً: ۲۴۶

کی تلاش میں آلور گئے اور دلی میں بیٹا اور ایک بچی چھوڑ گئے۔ میرزا صاحب سے امید تھی کہ اپنی اور بہو اور پوتی کی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیں گے۔ میرزا صاحب اُن کو کبھی تاخیر سے جواب دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے شکایت کی۔ میرزا صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

"مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا، بھائی اب میری انگلیاں نکمی ہو گئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آ گیا ہے۔ دو سطر بھی نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے بہت رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اسی وقت مرزا یوسف علی خاں آ گئے۔ میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا۔"[۱]

۱۔ اردوی: ۲۳۱۔

املای غالب

میرزا صاحب کی نوشتہ تحریروں اور اصلاحوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صحتِ املا کا بڑا خیال تھا۔ خود بھی غلطیٔ املا سے پرہیز کرتے اور شاگردوں سے بھی اسی توجہ کے متوقع رہتے تھے۔ اگر شاگرد معمولی غلطی کا مرتکب ہوتا تو صرف اصلاح پر اکتفا کرتے، ورنہ خطیٔ اصلاح کا منشا بھی واضح کر دیتے تھے۔ ایک بار جنونؔ بریلوی نے فارسی کے ماضی قریب کے صیغۂ واحد حاضر کو "ی" کے ساتھ لکھا۔
آج کل اہلِ ایران اسی طرح لکھتے ہیں، مگر اس زمانے میں یہ املا دستور نہ تھا۔ اس کی اصلاح میں ارشاد فرمایا ہے:

"پروردہ، رفتہ، یہ جتنے الفاظ ہیں ان میں یای تحتانی نہیں لکھتے بس وہی ہای ابنای حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے، تو تو رفتہ، پروردہ اس صورت پر رہے گی۔ اور اگر اس کو حرکت لازم آئے، تو علامتِ حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا۔ رفتۂ آمدۂ اور ان مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے"۔(۱)

شیو نرائن کو تحریر کیا ہے:

"چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبارِ اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل رہتا ہے، بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ خدا چاہے، تو املا کی غلطی کا ملکہ زائل ہو جائے"۔(۲)

۱۔ خطوط: ۱۰۹۱ (۲) اردوی: ۱۸ء ۵لم۔

شہابِ رامپوری کے کاتبِ دیوان نے "طیمور" لکھا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں:

"یہ لفظ "طوی" سے نہیں "تے" سے ہے اور پھر تیمور بوزنِ تنبور نہیں۔ دراصل تمر بوزن سمر ہے۔"(۱)

مرزا صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے خطوط اور نواب ناظم اور شہاب کے اصلاحی مسودوں کی خاصی تعداد ہمارے سامنے ہے، اُن سے نیز دوسرے شاگردوں کی املائی تصحیح سے جو اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کے اوراق میں محفوظ ہے، املا اور رسم خط سے متعلق حسبِ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) وہ اپنے عہد کی طرزِ کتابت کے مطابق یائے معروف و مجہول کے لکھنے میں بول چال سے زیادہ خطی خوشنمائی اور کاغذ پر باقی ماندہ جگہ کا لحاظ کرتے تھے۔ معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی جگہ معروف "ی" کا استعمال اُن کے یہاں اتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں دقت اور [illegible] کے متعین کرنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) اُن کی تحریروں میں ہائے مخلوط و بیشتر "ھ" کی جگہ ہائے سادہ "ہ" کی شکل نظر آتی ہے۔ اس زمانے کے کاتبوں کا دستور تھا کہ مخلوط "ھ" کو دو سادہ [illegible] سے ظاہر کرتے تھے، جیسے آنکہہ، ہاتہہ، لکہہ وغیرہ(۲)

مرزا صاحب اس کے بھی خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے اکثر اور شہاب و ناظم کے مسودوں میں اس قسم کے تمام الفاظ کو ایک ہی سادہ "ہ" سے لکھا ہے۔

(۳) اُس زمانے تک نثر کی رسم الخط کی دیکھا دیکھی اردو خط میں بھی اعراب بالحروف کا طریقہ ایک حد تک مروج تھا۔ مگر مرزا صاحب

---

(۱) [illegible] اور ہندی کے بہت سے الفاظ کا آخری حرف مفتوح ہوتا ہے ان کے زبر کو [illegible] اردو کتابت میں ہائے مختفی بڑھائی گئی تھی موجود ہیں ایسے تمام لفظ [illegible] بولے جاتے ہیں اس لیے اب ایک سادہ "ہ" سے ہی لکھنا چاہیے۔

لفظ کے شروع میں واقع ہونے والے الفِ مضموم کے علاوہ ہر جگہ اعراب بالحروف کرنا پسند کرتے تھے۔ بنیاب کے کاتب نے "مہرومہ" کو "مہر و ماہ" اور "اسی" کو "ایسی" لکھا تھا۔ انھوں نے اس کتابت کو غلط قرار دیتے ہوئے "مہر و مہ" بحذفِ الف، اور "اسی" بحذفِ یا اپنے قلم سے بنا دیا ہے۔

"مینہ" کا املا بھی بحذفِ "ی" پسند کرتے تھے۔ خود اُن کی اپنی تحریروں میں "مینہ" موجود ہے(۱) لیکن نواب فردوس مکاں کے اس شعر میں

آ کر ترے کوچے میں یہ کچھ ہم سے بن آئی جاتے ہوئے اک مینہ تھا کہ برسا گئیں آنکھیں

مینہ کو "مینہ" بنایا ہے۔

عام طور پر "پہنچنا" اور اُس کے مشتقات میں "ہ" کے بعد لوگ "و" لکھدیا کرتے ہیں۔ میرزا صاحب کے خود نوشتہ خطوں میں بھی کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے، مگر ایک جگہ کے علاوہ انھوں نے "پہونچنا" کبھی نہیں لکھا۔

انتخابِ دیوانِ اردو(۲) اور ناظم و بنیاب کے مسودوں کے کاتبوں نے بھی جہاں کہیں واؤ کے ساتھ لکھا تھا، میرزا صاحب نے اُس کی ہر مقام پر اصلاح کی ہے۔

ناظم کا ایک شعر ہے:

واں کے جانے سے رکے اور آگئی فصلِ بہار

تو مبارک جمع پھر وحشت کے ساماں ہو گئے

کاتب نے اس میں "رُوکے" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے "و" قلمزد کر دیا ہے۔

ایک شعر میں "دوکان" تحریر ہو گیا تھا۔ اس کا بھی واو کاٹ دیا ہے۔

---

(۱) مکاتیب: ۹۴۔ (۲) انتخابِ غالب اردو قلمی: ۳۹۔

بہنچا سبب کے اس شعر میں تھا:

پھکا جاتا ہے دل سینے میں، اللہ — چھپاؤں کیسا ملکہ سا روز نہاں کو؟

کاتب نے "پھوکا" جاتا ہے" لکھ دیا تھا۔ اس طرح اسے بگاڑ میرزا صاحب نے واو تھکا بدلا ہے

خود میرزا صاحب کے انتخاب دیوان اردو میں کاتب نے لکھا تھا:

"کھولتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ"

اسے میرزا صاحب نے "کھلتا" بنایا ہے۔[1]

"خور اور خورشید" کا عام املا بواو ہے۔ میرزا صاحب خورشید کو بے واو اور خور کو صرف خُر سے التباس دور کرنے کے خیال سے بواو لکھا کرتے تھے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ پارسی قدیم میں "خُر" بضم الخا، نور تاہر کو کہتے ہیں۔ "شید" بکسر شین کے معنی روشنی ہیں۔ ایرانی آفتاب کو بعد از خدا بزرگ جانتے تھے، اس لیے اُنھوں نے سورج کو خُر اور خورشید کہا۔ جب عرب و عجم مل گئے، اکابر عرب نے واسطے دفع التباس کے "خُر" میں واوِ معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا۔[2]

"منہ" کا پرانا املا "موںہ یا موںہہ" ہے۔ نواب ناظم کے مسودوں میں

---

(۱) انتخاب غالب اردو قلمی: ۳۲ (۲) رضا قلی ہدایت نے فرہنگ انجمن آرای ناصری در لغت خر، میں لکھا ہے: "و باہم آفتاب و متاخرین برای آن کہ بکلمہ خر مشتبہ نشود بواو نویسند، لیکن در زبان قدیم بے واو بود۔" اس سے میرزا صاحب کی رای کی تائید ہوتی ہے، مگر ڈاکٹر عبداللطیف صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اس مسلک کی جو توجیہ کی ہے، وہ درست نہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ قدیم فارسی میں "خُر" کی خ کو پیش تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کی پرانی زبان میں بعض لفظوں کا پہلا حرف ساکن ہوتا تھا، چنانچہ خور اور خود وغیرہ کی "خ" ساکن تھی اور "واد" مفتوح، یعنی "خ و" آپس میں ملکر ایک دہری آواز پیدا کرتے تھے۔ آگے چل کر جب ابتدا بسکون فارسی زبان میں ترک ہو گئی تو "و" کی تبدیل ہو کر تلفظ میں ایک ضمہ باقی رہ گیا، کتابت میں اب تک وہ "معدولی" واو برقرار ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ عربوں نے واسطے دفع التباس کے واو معدولہ بڑھا کے خور لکھنا شروع کیا۔ عرب کی زبان میں نہ خور کو دخل ہوا نہ خورشید کو، اور نہ خُر ان کی زبان میں دخیل تھا، پھر ان کو التباس کے دور کرنے کی فکر کیوں ہونے لگی۔" (مقدمۂ خطوط صفحہ ز)

متعدد جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ اسے کاتب نے "مونہہ" لکھا ہے میرزا صاحب نے ایک جگہ کو مستثنیٰ کر کے "منہ" بنادیا ہے۔

(۴) فارسی اور ہندی لفظوں کے املا میں عربی کے مخصوص حروف۔ ث ح، ص، ض، ط، ظ، ع، استعمال نہیں کرتے تھے۔ سیاح کو لکھتے ہیں:

"عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو اس کو سمجھنا کہ عربی ہے .... جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے، طوی بھی نہیں ہے، مثلاً تنشت معنیٔ فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوی سے غلط ہے۔"(۱)

بنیاتاب نے "طمانچہ" اور "طیمور" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے طمانچہ کو "تپانچہ" بنادیا، اور طیمور کے بارے میں یہ لکھا:

"یہ لفظ طوی سے نہیں، تے سے ہے۔ اور پھر تیمور بوزن تنبور نہیں۔ دراصل تِمُر بوزن سمُر ہے۔"(۲)

میرزا صاحب "ذ" کو بھی عربی کے مخصوص حرفوں میں شمار کرتے، اور کبھی کسی فارسی لفظ میں "ذ" نہیں لکھتے تھے۔ بنیاتاب کے مسودے میں "خذف" تھا اسے "خزف" بنا کر لکھا ہے:

"خزف بمعنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اس کی زے سے ہے۔"(۳)

گذشتن، پذیرفتن، وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات میں جہاں ذ مروج ہے، میرزا صاحب نے "ز" استعمال کی ہے۔ ناظم نے "سرگذشت" لکھدیا تھا، تو اسے "سرگزشت" بنایا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں۔

"گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن، یہ سب لفظ ذال سے ہیں۔ البتہ گزاردن" زے سے صحیح ہے۔ میرزا غالب نے پہلے نادانی سے "پھر سخن بہ دری

(۱) مقدمہ خطوط: ز، دارد دی معلیٰ: ج ۲، ۲۴۲ (۲) مکاتیب: ۱۰۴ (۳) ایضاً ۱۰۵۔

اور سینہ زوری سے "ذ" کو زبردستی سے خارج از لغت کی کوشش کی [illegible]
میں یہ لفظ "ز" سے لکھیے، تو مضائقہ نہیں، اگر فارسی ہیں، "ذ" لکھنا
ضروری ہے۔"(۱)

اس قاعدے کی انھوں نے اتنی پابندی کی ہے کہ ان عربی لفظوں میں بھی عربی کے مخصوص حروف نہیں لکھتے، جو اپنے معنی کی بنا پر ہندی یا ہندی بن گئے ہیں، جیسے طیار اور ذرا۔ طیار کے بارے میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے۔

"طیار ۔ ۔ ۔ ۔ لغت عربی، املا اس کی طائے حطی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [illegible]
اس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی، طوی سے تے بن گئی، یعنی جب کوئی شاہ [illegible]
شکار کرنے لگا، باز داروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ فلاں باز [illegible]
شدہ است و صید می گیرد۔"

بہرحال اب تای قرشت سے یہ لفظ بنا، یعنی تیار۔ اس لفظ کو مستحدث اور اسی
اردو اور تای قرشت بمعنی آمادہ، اشخاص اور اشیا پر مصدر کیا چاہیے۔"(۲)

"ذرا" اصلاً عربی ہے اور اس کا املا ذرہ ہے۔ [illegible] اردو میں ذرہ بتشدید بھی بولا جاتا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی آفتاب تخلص کا مقطع ہے:

اے آفتاب دل کو ذرہ نہ چین آس بن اس رشک مہ کو جلدی کہا جو ہے کوئی لادے

دوسرے مقطع میں بھی اسی طرح باندھا ہے:

---

(۱) حاشیہ دستور الفصاحت، ص [illegible]۔ ایڈیٹر ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریر لکھ کر مختصر سی کوشش کی ہے۔

(۲) خطوط: ۱/۳۸۱۔ مگر خان آرزو کا بیان ہے (چراغ ہدایت، نولکشور ص ۱۳۹) کہ طیار عربی میں بمعنی پرندہ ہے، لیکن ایرانی آمادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور بہار عجم کے مصنف کے نزدیک ایک صورت یہ بھی ہے کہ تیار عربی میں بمعنی جھنڈ ہے۔ بمعنی آمادہ جو فارسی میں آیا ہے ممکن ہے یہی ہو۔ آرزو کا قول صحیح ہے، تو غالب کا بیان کہ آمادہ کے معنی میں اردو ہے، قابل قبول نہیں اور اس کا املا ت اور ط دونوں سے ہو سکتا ہے۔ (معاصر ح ۸ نمبر ۱ ص [illegible])

اک بوسہ بھی جب تک اُسے انعام نہ ہو گا ~ یک ذرہ تسلی نہ ہو خورشید جہاں کو

اگرچہ اب تنہا مشدد نہیں بولتے، لیکن کسی ایسے لفظ کے ساتھ آئے، جو وزن یا ناپ کو ظاہر کرتا ہو، تو ذرہ ہی تلفظ کرتے ہیں، جیسے "اُسے میری ذرہ بھر پروا نہیں ہے" ظاہر ہے کہ یہ تشدید وہیں باقی رہ گئی ہے جہاں حقیقی معنے مراد ہیں۔ پس اس لفظ کو موجودہ معنی کے لحاظ سے اردو اور مستحدث کہا جائے گا۔ میرزا صاحب اسی کے قائل تھے اور ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں، انھوں نے "زرا" ہی لکھا ہے[1]

(۵) جن فارسی الفاظ کے آخر میں الف یا واو کے بعد "ی" آتی ہے، خواہ اصلی ہو یا اضافت وصفت کی علامت، عام کاتب اس "ی" پر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے عقل کو گالی دینا جانتے تھے۔ تفتہ کے خط میں صراحت فرماتے ہیں:

"دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو؟ . . . . غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے۔ یاد رکھو، یای تحتانی تین طرح پر ہے۔

(۱) جزوِ کلمہ

ہمای بر ہمہ مرغان ازاں شرف دارد
کہ استخوان خورد و جانور نیازارد

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یای تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

(۲) دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیای چرخ یا آشنای قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا

فدای تو شوم، رہنمای تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

---

(۱) اردوی: ۴۰۴ دیوان غالب کے خوشخط قلمی نسخے میں ایک جگہ کا تب نے ذرا کو ذال سے لکھا تھا میرزا صاحب نے یہاں بھی ذال کا سر جاقو سے چھیل کر زرا بنا دیا ہے۔

(۳) تیسری دو طرح پر ہے:

یای مصدری، اور وہ معروف ہو گی، دوسری یای توحید و تنکیر، اور وہ مجہول ہو گی، مثلاً مصدری، آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور! بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔

توحیدی، آشنائے، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہاؤ گے (۱)

اسی اصول کے ماتحت نواب فردوس مکاں کے مسودوں میں ایک جگہ "ہوئی سر" اور دوسری جگہ "رائی" کی ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔

مگر جہاں کہیں آخر کلمہ کی "ی" سے قبل الف یا واو مدہ نہیں ہے، وہاں میرزا صاحب نے ہمزہ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ نثر تہنیتِ غسلِ صحت میں "خجستگی و فرخندگئ چند" (۲) اور خلد آشیاں کے مدحیہ قصیدے جن گلیم عیبی من (۳) ان کے اپنے ہاتھ کا املا ہے۔ ان مواقع پر بھی انھوں نے اپنے قلم سے ہمزہ لکھا ہے (۴)

گشتہ تاریکئ روز م نہاں	کو چراغی تا نا بکو یم شام را؟
تابہ شی بہ ہمدمئ تا بسر برد	در چشم بخت غیر رہا کرد خواب را
سر منزل رسائی اندیشہ خودیم	در ماگست جلوہ پئ رہنمائی را
واں پہنچ کر جو غش آتا پئ ہم ہے ہم کو	صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو (۵)

بیغالب کے اس شعر میں بھی

آج ہیں موزونی طبع پہ نازاں ہوا	توسحہ ہے کہ رونق پذیر لب مرادیواں ہوا

میرزا صاحب نے "موزونئ طبع" بنا دیا ہے۔

(۴) ہای مختفی پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کو تحریف کی حالت میں بالعموم "ی" کے ساتھ بولا اور "ہ" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ کعبہ کی

(۱) خطوط ۱/ ۳۴۳ (۲) مکاتیب: ۱۳۱ (۳) ایضاً: ۲۱۴ (۴) مکاتیب غالب فارسی قلمی: ۸۷، ۸۹ (۵) نسخۂ اردو قلمی: ۲۷۔

دیوار اور غصہ کی بات کو کیبے کی دیوار اور غصے کی بات بولتے ہیں۔ خطوط میں
میرزا صاحب نے بھی زیادہ تر وسیٔ رواج عام کی پیروی کی ہے[۱]
لیکن انتخاب اردو میں تین چار جگہ غلط اور ناظم و بیتاب کے مسودوں میں
ایسے تمام الفاظ کی "ہ" قلمزد کر کے ہی کی جگہ "ی" بنا دی ہے، جس سے یہ
اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر تلفظ کے مطابق املا کو پسند کرتے تھے
ہاں، ایک لفظ "ریختہ" ایسا ہے، جسے انھوں نے تلفظ کے خلاف لکھا
بھی ہے اور لکھوایا بھی۔ نواب ناظم کے اس شعر میں

یہ طرز کسی اور کو کب یاد ہے ناظم   ہیں ریختے میں پیرو انداز جو بلم

میرزا صاحب نے ریختے کو اپنے قلم سے ریختہ بنا دیا ہے۔
میری رای میں ریختہ کی "ہ" پر اصرار، ریختی" سے التباس دور کرنے کے
خیال سے ہوگا، جو اس زمانے میں یای معروف و مجہول کی کتابت میں
فرق نہ ہونے کے سبب سے بسہولت پیدا ہو سکتا تھا۔
(۵) ہای مختفی پر ختم ہونے والے ہندی یا ہندی الفاظ کی کتابت میں میرزا
صاحب ایک روش کے پابند نہ تھے "تھانہ، پھوڑیہ، اور کیوڑہ" کو باوجود
ہندی ہونے کے اور "نقشا" کو باوجود ہندی ہونے کے "ہ" سے
لکھا ہے۔ جھروکہ، درشن، پرچہ ہنڈوی، گل تکیہ، نولہ، چبوترہ، دونہ،
جولاہہ، روزمرہ وغیرہ بھی ان کے خطوں میں موجود ہیں، جنھیں زیادہ تر
"ہ" سے اور کمتر الف سے لکھتے ہیں[۲]

لفظ گلہ بمعنی شکوہ کو خوشخط دیوان اردو کے کاتب نے ہر جگہ "گلا"
لکھا ہے۔ میرزا صاحب نے کسی جگہ اس کی تصحیح نہیں کی۔ لیکن

۱۔ انتخاب اردو قلمی ۱۲۱، ۱۳۱، ۲۴، ۳۰۱، مقدمہ خطوط غالب میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میرزا صاحب
ہندی الفاظ جیسے دبیہ، راجہ، اور لالہ وغیرہ کے سوا "ہ" سے نہ لکھتے تھے اور فارسی و عربی کے اردو میں مستعمل "ہ" پر ختم ہونے والے لفظوں کو اکثر الف ہی
سے لکھتے تھے۔ ۲۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس پر تنقید کرتے ہوئے رسالہ معاصر پٹنہ ج ۲ نمبر ۵ ص ۴۳ میں میرزا صاحب کی دستی تحریروں سے
یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ کسی ایک روش کے پابند نہ تھے۔ چنانچہ مذکورۂ بالا مثالیں انھیں کے مضمون سے منقول کی گئی ہیں۔

ناظم کے مسودے میں "ناظر" بنا دیا ہے۔ اس سے یہ ایک قائم کی جا سکتی ہے کہ آخر عمر میں عربی فارسی کے ان الفاظ کو بھی جو اردو میں مکمل طور سے ... ہیں یای مختفی سے لکھنا پسند کرتے تھے۔

(۸) اردو کے جن الفاظ میں الف یا واو مدہ کے بعد "ی" واقع ہوتی ہے۔ جیسے جائے، پائے، ہوئے۔ میرزا صاحب کی تحریروں میں ان کی کتابت یکساں نہیں ہے۔ وہ کبھی انھیں بے ہمزہ کے اور کبھی ہمزہ کے ساتھ "جائے" "ہوئے" لکھتے ہیں۔ اسی طرح یای معروف کے بعد "ی" ہو جیسے لیجیے تو یای اول کو کبھی بصورت ہمزہ، کبھی بصورت یا اور کبھی "ی" اور ہمزہ دونوں کے ساتھ لکھتا ہے۔
لیکن نواب ناظم اور جناب کے مسودوں میں "کیجیے، دیکھیے، چاہیے، بھیجیے، ہمسائے، آجائے، لائیے، الف جاہلی، آئے، ہوئے، پھیلا دیئے" وغیرہ میں سے ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرزا صاحب ان لفظوں کو بے ہمزہ کے انسب جانتے تھے۔

(۹) نون غنہ کے استعمال میں میرزا صاحب نے احتیاط کی ہے۔ پانو کا املا تین طرح کا مروج تھا: پانو، پانوں، پاؤں۔ میرزا صاحب اول الذکر کو صحیح اور باقی دونوں کو غلط کہتے تھے، چنانچہ ناظم اور جناب کے مسودوں میں جگہ جگہ یہ اصلاح موجود ہے۔ جنون بریلوی نے پاؤں لکھا تھا۔ آپ کو بتاتے ہیں کہ پاؤں کی یہ املا غلط ہے۔ پانو، گانو، چھانو درست ہے اور کسی شاگرد سے "پانوں" سرزد ہوا تھا۔ اسے لکھتے ہیں:

"پانو، گانو، چھانو ہے۔ آگے اس کے نون لکھنا غلط ہے مگر ہاں بجہت جمع یوں لکھنا چاہیے، پانوؤں۔"[۲]

"پوچھنا" کو بیتاب ... نواب ناظم کے کاتبوں نے "پوچھنا" لکھا تھا۔

ا خطوط: ۱۱۸۶ ... خطوط ... میں ڈاکٹر ... صاحب فرماتے ہیں۔
"پانو" گانو، چھانو، دانو کی یہ املا لکھنا بہتر ہے، اس لیے کہ ایک تو غنہ یہاں حقیقت میں الف میں ہے۔ دوسرے جمع کی محرف حالت ... الفاظ کی صورت ... ہوتی ہے: پانوں، گانوں وغیرہ

میرزا صاحب نے اس غلطی کی بالالتزام اصلاح کی ہے۔

"دونوں" کو بعض جگہ "دونو" بے نون آخر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے نون کے ساتھ لکھتے تھے۔ مذکورۂ بالا مسودوں میں بھی اس لفظ کی اصلاح کی ہے۔

"بھونکا" کا تلفظ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ واو کے بعد نون غنہ محسوس ہوتا ہے۔ بیتاب کے کاتب مسودۂ دیوان نے بھونکا لکھ دیا تھا۔ میرزا صاحب نے اسے نون غنہ سے پاک کر کے بھوکا بنا دیا ہے۔

(۱۰) ہای مخلوط کی کتابت میں شاید فصحای دہلی کے تلفظ کا لحاظ زیادہ رکھا ہے۔ چنانچہ نثر پنہاں میں اُن کے نزدیک بای فارسی اور نون کے درمیان ہای مخلوط التلفظ ضرور ہے۔ "یہاں" کے مخفف "ہاں" کو دلی والے یہاں بولتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس تلفظ کو افصح قرار دیا ہے۔ "نگھارنا" کی جگہ "کھنگارنا" اور "گڑ پنکھ" کی جگہ "گڑ پھنک" یا "گڑ پھنگ" تلفظ کا اتباع معلوم ہوتا ہے۔ "ٹھہرنا" دلی میں ٹہرنا بولا جاتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا صاحب ہمیشہ ایک "ہ" سے لکھتے ہیں۔ ناظم نے لکھا تھا

"جو آگئے ہو مرے گھر، تو کوئی دم ٹھیرو"

میرزا صاحب نے اسے "ٹہرو" بنایا۔ بیتاب کا شعر تھا:

کیسا مزہ دکھاتے ہیں ہم بھی تو ٹھیر جا تقریر یں کر کے اور یہ ناصح تو ہل گیا

اس میں میرزا صاحب نے "ٹہر تو جا" اصلاح کی۔

مخلوط "ھ" جب لفظ کے آخر میں آتی ہے تو اس کی آواز بہت ہلکی

بخلاف اس کے اگر واحد کی لکھاوٹ "پانوں" یا "پاؤں" قرار دیجیے، تو جمع محرف "پانوئوں" یا "پادنوں" بنتی ہے جو ہرگز قبول کرنے کے لائق نہیں۔" میں عرض کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا استدلال قوی نہیں۔ کنواں، دھواں، رواں جوں کی جمعیں کنویں کنووں دھویں، دھووں، رویں، رووں اور جویں، جوؤں ہیں۔ مذکورہ اصول کے پیش نظر ہم یوں کہتے: "اس کنویں کا پانی شہر بھر کے کنواؤں سے بہتر ہے" حالانکہ کنوؤں سے بہتر ہے" سب کی بول چال ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ ان لفظوں میں الف اور واو دونوں کے بعد نون غنہ ہے، اس لیے بہتر املا چھانوں اور گانوں ہے۔

ہو جاتی ہے، ایسی ہلکی گویا اس کا وجود ہی نہیں۔ میرزا صاحب نے اس ہلکی "ہ" کا نام مضمرہ رکھا ہے، اور کتاب میں اکثر حذف کر دیتے ہیں چنانچہ رتھ کو رت، ہاتھی کو ہاتی اور اودھ اور میرٹھ کو اود اور میرٹ اور مجھ کو، تجھ کو کی جگہ مجکو، تجکو[1] لکھا ہے۔ "ہاتھ" کو کبھی خود ہات لکھتے تھے[2] مگر ناظم کے مصرعوں ع: ہات سے رضوان کے چھوٹا شانہ زلفِ حور میں، اور ع: ہاتھ میں خط لیا کہ دم نکلا، میں کاتب نے ہات اور ہاتھ لکھا تھا، ان دونوں شکلوں کو "ہاتھ" میں تبدیل کر دیا۔ مگر ساتھ کو ہمیشہ "ہ" سے لکھتے تھے، تاکہ سات سے، جو عدد ہے، التباس نہ ہو۔ اسی طرح اُن لفظوں میں بتاکید ہای مخلوط لکھ دیتے تھے، جن میں بول چال کے اندر "ہ" موجود ہے، مثلاً نواب ناظم کے مسودے میں کاتب نے "ڈھونڈا" لکھا تھا، میرزا صاحب نے اسے "ڈھونڈھا" بنا دیا ہے۔ بتیا سب کے کاتب دیوان نے "منہ چڑانا" اور "پگلنا" لکھا تھا میرزا صاحب نے چڑھانا اور پگھلنا کر دیا ہے[3]

(۱۱) بعض ہندی الفاظ کا تلفظ ایک مقام پر "ڈ" سے اور دوسرے پر "ڑ" سے کیا جاتا ہے۔ جیسے گاڑی، بوڑھا، کہ اضلاع سہارنپور و میرٹھ میں "گاڈی" اور "بوڈھا" بولتے ہیں۔ میرزا صاحب نے ان دونوں لفظوں میں سے پہلے کو ڈ سے[4] اور دوسرے کو ایک جگہ ڈ سے اور دوسری جگہ "ڑ"[5] سے لکھا ہے۔

(۱۲) پہلے زمانے میں "اُن نے" اور "اُس سے" کو ملا کر "اُنے" اور "اُسے" بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ میرزا صاحب بھی دو لفظ ملا کر لکھ دینے کے عادی ہیں، مگر اُن دونوں لفظوں کو نہیں ملاتے تھے، جن میں سے اول کا حرف اخیر اور دوسرے کا پہلا حرف ایک ہو چنانچہ ان مثالوں میں بتیا سب کے دیوان کے اندر اصلاح کی ہے۔

(۱) مکاتیب: ۷۴، ۷۹، ۹۱، ۱۱۸، ۱۲۰ وغیرہ (۲) ایضاً ۹۵، ۱۲۸ (۳) مقدمہ خطوط غالب از ڈاکٹر صدیقی
(۴) مکاتیب ۲۲، ۸۳ (۵) مکاتیب: ۸۴، ۱۰۵

(۱۳) لفظِ آئینہ جب فاعلن کے وزن پر نظم میں باندھا ہے، تو اُسے "آینہ" لکھا ہے، آئنہ نہیں لکھا، اور یہی املا ناظم کو بتایا ہے۔ اسی طرح خامشی اور بیہدہ میں "و" کے اضافے کو منع کیا ہے۔

عربی الفاظ کا املا

میرزا صاحب عربی الفاظ کا املا ایرانیوں کے انداز پر لکھتے تھے۔

(۱) بیتاب نے ایک شعر میں "جز لاینفک" لکھا تھا[۱] میرزا صاحب نے انھیں بتایا کہ بجائے اس کے "جزوِ لاینفک" لکھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اس لفظ کو سہ حرفی بتانا درست ہے، لیکن اس کے آخر میں ہمزہ کی جگہ واؤ لکھنا عجمیوں کا دستور ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم لکھتے ہیں:

"تبدیلِ حرف چناں کہ در بدء... بمعنی ابتدا کردن و آغاز، ہمزۂ آخر را بواو بدل کردند" وہمچنیں در جزء، بمعنی پارۂ چیزی، بجائ ہمزہ واؤ نویسند و خوانند مگر بشرطی کہ آں را مضاف نمایند، چوں جزوِ کتاب وجزو بدن والا در عبارتِ پارسی بدون ہمزہ نویسند"[۲]

(۲) جن عربی اسم فاعل کے صیغوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے دائم، قائم وغیرہ، اُن کا املا ہمزہ کے ساتھ ہے۔ مگر میرزا صاحب نے بیشتر "ی" کے ساتھ لکھا ہے اور اگر ہمزہ ہے، تو "ی" کے اوپر؛ چنانچہ مائدہ کو مایدہ، مطمئنہ کو مطمینہ، جائز کو جایز، اور طائر کو طایر[۳] لکھا ہے۔ لفظ قائل اور مائل کو پہلے قائل اور مائل لکھا تھا۔ اس کے تیرہ دن بعد قایل اور مایل لکھا[۴]

(۳) یہی حال عربی کی اُن جمعوں کا ہے، جو فواعل وزن پر آتی ہیں، مثلاً حقائق، دقائق۔ میرزا صاحب نے انھیں بھی حقایق، دقایق، طبایع وغیرہ لکھا ہے[۵] جو عجمیوں کی پیروی ہے۔

(۴) مولانا اور مولانا کی کتابت میں میرزا صاحب کے یہاں دورنگی

(۱) مکاتیب: ۱۰۵ (۲) بہنج الادب: ۲۰۸ (۳) مکاتیب: ۴۶ (۴) ۱۱۷، ۱۱۶ (۴) ایضاً: ۷۷، ۷۲

(۵) ایضاً: ۷۰، ۵۴، ۶۰

پائی جاتی ہے۔ ایک مکتوب میں انھوں نے "مولانا" لکھا ہے۔ مگر اس کے سولہ دن بعد مولٰنا اور اولٰنا لکھا ہے(۱)

(۵) لفظ "مؤید" اور "رؤسا" کو بے ہمزہ کے "موید" اور "روسا" لکھا ہے؛ یہ بھی عجمی تتبع ہے۔

املا کی غلطیاں

میرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے۔ جو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ہر زبان کے الفاظ میں پائی جاتی ہے۔

(۱) اردو کا لفظ سوچنا ہے۔ اس کے مشتق "سوچ" کو انھوں نے "سونچ" اور سونچنا" لکھ دیا ہے(۲) اسی طرح "پہنچنا" کے مشتق "پہنچا" کو ایک جگہ "پہونچا" لکھ گئے ہیں(۳)۔ "گھٹائیں" ان کے قلم سے "گھٹائیں" بن گئی ہیں(۴)۔ "اکھاڑ ڈالنا" کی جگہ "اکھاڑ ڈالنا" اور "فرمایئے" کی جگہ "فرمائیے" بتشدید ہے(۵)۔

(۲) عربی کے معرف باللام اسموں سے پہلے حرف جر "ب" ہو، تو اُسے الف کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بالکل، بالفعل، باللہ کو "با لکل"، "با لفعل"، اور "با للہ" تحریر کر دیا ہے(۶)۔

(۳) فارسی کے جن لفظوں میں الف ممدودہ کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے گنجایش، آیندہ وغیرہ، اُن کا صحیح املا "ی" کے ساتھ ہے، اور اسی طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے، مگر پایندہ اور فزایندہ کو "پائندہ" اور "فزائندہ" لکھا ہے(۷)۔ خرسم کو خورسم بواو لکھ دیا ہے(۸)، حالانکہ اسی کے مرکب "خرمی" کو بغیر واو لکھا ہے(۹)۔

فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں "بد" آتا ہے، جیسے موبد، اسپہبد، وہ بفتح با صحیح ہیں۔ میرزا صاحب نے اسپہبد کو اسپہبُد بضم با لکھ دیا ہے(۱۰)۔

(۴) انگریزی الفاظ اپنے زمانے کے تلفظ کے مطابق لکھے ہیں۔ چنانچہ لارڈ کو

---

(۱) مکاتیب: ۵۴ (۲) ایضاً: ۳۰، ۴۷۔ (۳) ایضاً: ۴۱، ۷۔ (۴) ایضاً: ۷۱ (۵) ایضاً: ۲۱، ۷۱ (۶) ایضاً: ۸، ۶۴، ۷۶ (۷) ایضاً: ۲۱، ۲۲، ۲۷ (۸) ایضاً: ۱۰ (۹) ایضاً: ۷۶ (۱۰) ایضاً: ۳۶

"لارڈ" بورڈ" کو بورڈ، ریونیو کو رینو، سارٹیفکٹ کو سارٹیفکٹ، پنشن کو پنسن، کلکٹر کو کلکٹر، ہارڈنگ اور ڈلہوزی کو ہارڈنگ اور ڈلہوسی اور اسٹیشن کو اسٹیشن لکھدیا ہے۔

علامات اوقاف

میرزا صاحب کی تحریروں میں پرانی علامات اوقاف کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (ط) لکھتے ہیں۔ جو لفظ فقط کی طغرائی شکل ہے۔(۱) کبھی بارہ کا ہندسہ (۱۲) بھی اس مقصد کے لیئے استعمال کرتے ہیں، جو لفظ "حد" کے عدد ہیں۔ اس ہندسے کے بارے میں لطیفے کے طور پر مہر کو لکھتے ہیں:

"صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کر دیتا ہوں۔"(۱)
چند خطوں میں یہ علامت (ع) پیراگراف کے آخر میں لکھی ہے، جو لفظ بیاض کا مخفف ہے۔ یہ علامت بادشاہوں کے فرامین کے آخر میں بھی پائی جاتی ہے، جس سے غرض یہ تھی کہ آگے کوئی لفظ نہیں لکھا جا سکے، اور اگر کوئی لکھدے، تو جعلی متصور ہو(۲) رفتہ رفتہ نہ صرف کسی تحریر کے آخر میں بلکہ ایک پیراگراف کے ختم پر بھی بطور علامت خاتمہ لکھنے لگے۔

کبھی نئے جملے کے پہلے لفظ کے اوپر یہ شکل (ــــ) بناتے ہیں، جو عربی کے لفظ "بت" بمعنی قطع کی شکل ہے۔ کچھ خطوں میں نئے پیراگراف کے آغاز میں بھی یہ علامت بنائی ہے۔

ایک دو خطوں میں میرزا صاحب نے نئے پیراگراف کو دوسری سطر سے شروع کیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ وہ انگریزی طریق کتابت سے آگاہ تھے۔

ایک خط میں صفحہ ختم ہو جانے کے باعث کچھ عبارت حاشیے پر

---

(۱) اردوی: ۲۵۷ (۲) رسالہ صلای عام دہلی، مئی سنہ ۱۹۱۳ء ص ۲۸۔

لکھنا پڑی تھی۔ اس کے ربط کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اُنھوں نے (۱۵) کا ہندسہ متن کے آخر اور حاشیے کے شروع میں لکھا ہے!

شعر یا مصرع کے پہلے یہ علامت (ﮯ) ضرور لکھتے تھے، جو لفظ "بیت" کی مخفف شکل ہے۔ ایک بار نام و تاریخ لکھدینے کے بعد کوئی بات یاد آئی، تو اسے "لہ" لکھ کر تحریر کیا ہے۔ عربی کا یہ فقرہ عموماً مجموعہای اشعار میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے معنی ہیں "اُس کا"، اس لیے کسی ایک شاعر کے متفرق شعر لکھتے وقت ہر نے شعر سے پہلے "لہ" لکھدیتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہوجائے کہ یہ شعر بھی اسی شاعر کا ہے، جس کا شعر ابھی گزر چکا ہے۔ میرزا صاحب نے اسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے۔

حسابی رقوم

میرزا صاحب نے روپیوں کی تعداد ظاہر کرنے کے لیے حسابی رقوم بھی لکھی ہیں، جو بسا اوقات تعداد ظاہر کرنے والے الفاظ کے اوپر لکھی گئی ہے، لیکن چند خطوں میں عبارت کے بجائے رقموں پر اور کچھ میں رقموں کی جگہ عبارت پر بھی اکتفا کی ہے۔

میرزا صاحب نے سَو روپے کی رقم کو اس طرح لکھا ہے (۱۰۰عہ) آج کل اسے ایک سو ایک پڑھا جائے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک کی رقم (عہ) انگریزی کے لفظ بمعنیٰ صرف کی جگہ لکھی گئی ہے، تاکہ کوئی شخص جعلسازی سے سو کی رقم کے آگے کچھ بڑھا نہ سکے۔

---

۱ مکاتیب: ۸، ح ۱ (۲) ایضاً: ۱۰

طباعتِ خطوط

میرزا صاحب کی ممانعت

سب سے پہلے منشی شیونراین اور تفتہ کو میرزا صاحب کے خطوط کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ ان دونوں نے علیحدہ علیحدہ میرزا صاحب کو اپنی تجویز سے مطلع کر کے اشاعت کی اجازت چاہی۔ اس عہد تک مراسلت میں انشا پردازی کے تمام اصول وضوابط کا لحاظ ضروری شمار ہوتا تھا، اور میرزا صاحب کے خیال میں زبان اردو کے ہیولے اس بارِ گراں کا تحمل دشوار تھا۔ چنانچہ ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کی فرمائش اردو کے جواب میں انھوں نے یہ لکھ بھیجا تھا کہ اس زبان میں زورِ قلم صرف کر کے معانیٔ نازک پیدا کرنا اور اس طرح اپنا کمالِ انشا ظاہر کرنا مشکل ہے۔ اس میں گنجایشِ عبارت آرائی کہاں، جو کوشش کی جائے؟ لہٰذا مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو مراسلت کا وتیرہ پیچھا چھڑانے کے لیے شروع کی تھی(۱)، اور اس وجہ سے کبھی قلم سنبھال کر اور دل لگا کر کوئی خط نہ لکھا تھا۔ ان یاران باصفا کی تجویز منظور کر لینے میں خطرہ تھا کہ کہیں کمالِ انشائے فارسی کے مداح اردو نثر دیکھ کر شکوۂ سستی و پرنکتہ چینی نہ کرنے لگیں، اور اردو کا یہ پھیکا پکوان فارسی کی اونچی دکان کی شہرت پر دھبا نہ لگا دے۔ اس لیے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو منشی شیونراین کو جواباً لکھا:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ

---

(۱) اردوئے معلیٰ ص ۳، ۳۳، ۳۶ پر وہ خطوط ملاحظہ ہوں جن میں میرزا صاحب نے اردو نثر لکھنے سے انکار کیا ہے، اور سنہ تحریر سے انکار کے وجوہ بھی بتائے ہیں۔

خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ نام [illegible] مرتب ہے۔
گویا جواہر بے بہا کا گلدان ہے، کمال کو پہنچی [illegible]
چونکہ صحبت جناب غالب سے مالا مال [illegible]
انشا کا عودِ غالب (مجموعہ) مناسب ہے [illegible]
سے مطابق پایا۔"[1]

یہ تجویز منظور ہو گئی اور منشی ممتاز علی نے اس مجموعے [illegible] ہوئی تھی کہ انہیں خیال پیدا ہوا کہ مرزا صاحب [illegible] کر کے اس مجموعے میں شامل کیے جائیں۔ [illegible] امداد کی اور انہیں ایک اور مجموعہ [illegible] صاحب کے علم اور اُن کی امداد سے مرتب کیا [illegible]

غالب کے خطوں کا دوسرا مجموعہ

یہ مجموعہ مجبر مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے [illegible] صاحب کو پہلے سے دے دی تھی اور خواہش کی تھی کہ ان [illegible] بھی مہیا کر دیں، جو دوسرے احباب [illegible] میرزا صاحب نے اس التماس کو قبول کر لیا تھا۔ [illegible] اُن کا یہ خیال تھا کہ صرف وہ خط مرتب کیے جائیں جن میں کوئی [illegible] خوبی ہو۔ روزمرہ کی [illegible] اس لیے مجبر کو جواب میں لکھا تھا:

"آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب [illegible] کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل [illegible] تحت میں، منشارِ اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے، نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے "ہرکارہ آیا۔ خط لایا۔ آم پہنچے۔ [illegible]

۱۔ عود ہندی: ۵ ۲ ۶۔

"بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام۔"
یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے۔ غرضکہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب
یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائقِ شمولِ مجموعۂ نثرِ اردو کہاں ہے؟
یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔"[1]

اسی زمانے میں نساخ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کی نقل بیخبر کو روانہ کرتے ہوئے تمہیداً تحریر کرتے ہیں:

"پیر و مرشد، کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام اور نساخ ان کا تخلص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ دفترِ بے مثال مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثرِ اردو کے لائق ہے۔ آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔"[2]

مجموعۂ خطوط میں ان نجی خطوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ بیخبر نے اُن کے اس مشورے کو نہ مانا، اور ہر قسم کے خط شاملِ مجموعہ کر لیے۔

مقامِ طباعت

میرزا صاحب کا خیال تھا کہ بیخبر اس مجموعے کو الہ آباد میں جہاں وہ مقیم تھے، طبع کرائیں گے، اس لیے ایک انگریز کے استفسار کے سلسلے میں بیخبر کو لکھا:

"جناب کیمپس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدمِ تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثرِ اردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا، مگر یہ لکھا کہ الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصولِ اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔"[3]

---

(۱) عودِ ہندی: ۷۴ (۲) ایضاً: ۱۲۵ (۳) ایضاً: ۱۷۵۔

مگر بیخبر نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا کہ منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے اپنے مطبع میں طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ میرزا صاحب ان بزرگ سے واقف تھے، اس لیے بیخبر کی اس خبر پر اطمینان ظاہر کیا، اور جب بیخبر نے دوبارہ ان کا ذکر کیا، تو تحریر فرمایا:

"حضرت پیر و مرشد، اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے، اور وہ میرے دوست ہیں"(۱)

طباعت میں تاخیر

بیخبر نے مکاتیب کی جمع و ترتیب کا کام سنہ ۱۲ء میں شروع کیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب الیہوں میں سے جو بزرگ خود ان کے دوست تھے، ان سے براہ راست، اور جن کی خدمت میں خود نیاز حاصل نہ تھا، ان سے بتوسط غالب خطوط کی نقلیں مہیا کیں اور سنہ ۶۵ء میں یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ لیکن میرزا صاحب نے، جو سنہ ۶۳ء کے بعد سے طباعت کا انتظار کرنے لگے تھے، آخر کار مجبور ہو کر تقاضا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک خط کے آخر میں بیخبر کو لکھا ہے:

"اور ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح، یا چھپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔"(۲)

احباب کے تقاضے

اس مجموعے کی ترتیب میں مختلف اصحاب کے پاس سے خطوط کی نقلیں منگائی گئی تھیں، اس لیے ملک میں اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ جب اشاعت میں زیادہ تاخیر ہو گئی، تو میرزا صاحب کے پاس تقاضے کے

---

(۱) عود ہندی: ۱۳۸ (۲) ایضاً: ۱۲۵

خطوط آنے لگے۔ ان تقاضوں سے پریشان ہو کر میرزا صاحب نے ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو بیخبر کے نام حسب ذیل خط لکھا؛

"ہاں، حضرت، کہئے، منشی ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعۂ نثر اردو چھپے گا، یا چھپا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔"۱

پنجاب احاطے کی مانگ

ان تقاضا کرنے والے احباب میں سب سے زیادہ حصہ زندہ دلان پنجاب نے لیا تھا۔ ان سے مجبور ہو کر میرزا صاحب نے منشی ممتاز علی خاں کو ملزم ٹھہراتے ہوئے بیخبر کو تحریر کیا:

"جی حضرت، یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطے میں اس کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل مجھ کو بھیج دیجیے۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب دہی پارسل ہو۔"۲

میرزا صاحب کا دیباچہ

غالباً اس کے جواب میں بیخبر نے میرزا صاحب کو لکھا کہ آپ مجموعۂ نثر اردو کے لیے دیباچہ لکھ کر روانہ فرمائیں، تو تب اسے مطبع کو بھیجی جائے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے تحریر فرمایا:

"میں صاحب فراش ہوں۔ اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں۔"۳

بیخبر نے اس کے بعد بھی دیباچہ لکھنے کی درخواست کی، تو انھیں ظریفانہ

(۱) عود: ۱۴۴ (۲) ایضاً: ۱۳۵ (۳) ایضاً: ۱۳۸۔

انداز میں لکھا:

"بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم، کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے، تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اس مجموعے کا چھپنا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ، فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر — آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ، یعنی مالکانِ تحریر، میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟"

عود ہندی

بیخبر نے میرزا صاحب کا عذر تسلیم کر کے اپنے جمع کردہ خطوط منشی ممتاز علی خاں کے پاس بھیج دیے۔ منشی صاحب نے سرور اور بیخبر کے مجموعہای مکاتیب کو یکجا کر کے عود ہندی نام رکھا، اور خود دیباچہ لکھ جمع و ترتیب میں سعی کرنے والے اصحاب کی محنت کی اس طرح داد دی:

... نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب، جن کی ذاتِ باکمالات محتاج تعریف نہیں۔ . . . سارا ہندوستان انھیں جانتا ہے۔ ایران تک ان کی جادو بیانی کا چرچا ہے۔ مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی کی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں . . . مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔ یہ دولت اربابِ شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثر اردو اُن کی اور وں کی

(۱) عود: ایہاں یہ امر واضح کر دینا باعث دلچسپی ہوگا کہ تحریر کے معنی غلام آزاد کرنے کے ہیں، اور مالک تحریر وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس غلام ہو۔ میرزا صاحب نے ازراہ لطیفہ تحریر سے عام بول چال کے مطابق، لکھنا مراد لیا اور مالکِ تحریر کو منشی یا ادیب کا ہم معنی قرار دے کر بیخبر سے یہ خواہش کی کہ جب آپ خود مالکِ تحریر ہیں تو مجھ بڈھے کو کیوں تکلیف دیتے ہیں، دیباچہ خود کیوں نہیں لکھ لیتے۔

فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے، یہ سلاستِ بیان، یہ شستگیٔ زبان، روزمرہ کی صفائی، اداؤں کی شوخی، کسی کو کب میسر ہے؟ اسے بھی ترتیب دیجیے، قدر دانوں پہ احسان کیجیے۔ میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا، تو انھوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب تک کے اُن کے نام آئے تھے، سب کو یکجا کر کے اور اسپر ایک دیباچہ لکھ کے، وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصے تک سرگرم تلاش رہا۔ جا بجا سے اور تحریریں میرزا صاحب کی بہم پہنچا ئیں۔ بڑی محنت اٹھائی، تب تمنا بر آئی، اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔

خواجہ غلام غوث خاں صاحب بہادر بیخبر، جو نواب معلّی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالکِ مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرتِ غالب صاحب کے مخلص باختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہتیرا کچھ ذخیرہ اُن کی بدولت بہم پہنچا۔

اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوے خطوط اور اُن کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوے رقعات، اور خاتمے میں چند نثریں ہیں، جو جنابِ غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔ عودِ ہندی اس کتاب کا نام ہے۔"[۱]

عودِ ہندی کا سال طباعت

عودِ ہندی کا یہ ایڈیشن منشی ممتاز علی خاں نے اپنے مطبع مجتبائی واقعہ شہر میرٹھ میں طبع کیا۔ کتاب ۱۸۸ صفحوں پہ تمام ہوئی۔ خاتمۂ طبع

۱۔ عود: ۲ و ۳۔

میرٹھی نے لکھا۔ آخر میں جاں نثار کی قطعے اضافہ کیے گئے۔ ان میں ایک قلق کا، ایک اُن کے شاگرد محو میرٹھی کا اور بقیہ دو غالباً خود منشی ممتاز علی خاں کے ہیں۔

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ ہجری میں طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آخری صفحے کے نچلے گوشے میں ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ ہجری (۲۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء) درج ہے، جس سے تاریخ و ماہ بھی متعین ہوجاتے ہیں۔

میور صاحب کی نذر

آخری قطعے کے مطالعے سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ منشی ممتاز علی خاں نے میور صاحب (سر ولیم میور گورنر ممالک مغربی وشمالی) کی خدمت میں عود کا مطبوعہ نسخہ نذر گزرانا تھا۔ سر ولیم میور علوم مشرقیہ کے عالم تھے۔ بہرحال، جو عودِ ہندی کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حاکم کے نام معنون کرکے نشر واشاعت کی تکمیل پر مہر توثیق ثبت کریں۔ اس زمانے میں اردو زبان میں ایسی نادر کتابیں معدودے چند شائع ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ بعض سیاسی مصالح کے ماتحت نئی مفید کتابوں کی اشاعت میں، انعام کے نام سے یا امداد طبع کہہ کر اخراجات کا بار اٹھا لیا کرتی تھی۔ بعید نہیں کہ منشی صاحب کو بھی کچھ روپیہ مل گیا ہو۔

میرزا صاحب کا حق تصنیف

ایک بار میرزا صاحب نے کتاب کی فوری اشاعت کا تقاضہ کرتے ہوئے بیخبر کو لکھا تھا:

"اور ہاں، حضرت، وہ مجموعہ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔"

عود ہندی میرزا صاحب کے انتقال سے کئی ماہ پہلے شائع ہوچکی تھی۔ لیکن اُن کے مکاتیب میں اس کی طباعت یا حق تصنیف کے نسخوں کی وصولیابی کا ذکر نہیں پایا جاتا۔

عود کے رقعات کی تعداد

عود ہندی کے کل رقعات کی تعداد ۱۶۲ ہے۔ ان میں ۲۵ سرور کے نام، ۲ صاحب عالم مارہروی کے نام، ۲ شاہ عالم مارہروی کے نام، ۲۰ شفق کے نام، ۴ عزیز کے نام، ۱۳ مجروح کے نام، ۱ میر سرفراز حسین کے نام، ۱ علائی کے نام، ۱ تفتہ کے نام، ۱۸ قہر کے نام، ۲۵ بیخبر کے نام، ۱ نساخ کے نام، ۱ ظہیر الدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام، ۱ شیفتہ کے نام، ۱ رعنا مراد آبادی کے نام، ۱ مرزا رحیم بیگ کے نام، ۱۰ شاکر کے نام، ۱۵ جنون بریلوی کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام، ۱ سید محمد عباس صاحب کے نام، اور ۱ منشی غلام بسم اللہ صاحب کے نام ہے۔

ان خطوط کے علاوہ دو تقریظیں، قہر کی مثنوی کی تقریظ اور سرور کی گلزار سرور کی تقریظ، اور تین دیباچے، حدائق الانظار کا دیباچہ، قواعد نذیرہ نابینا کا دیباچہ، اور مرزا کلب حسین خاں بہادر کے مجموعۂ قصائد کا دیباچہ بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ایک خط بیخبر کا بھی درج کیا گیا ہے۔ جو میرزا صاحب کے خط کا جواب اور اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے مرتب کی نظر میں شامل مجموعہ ہونے کے قابل تھا۔

غالب کے خطوں کا تیسرا مجموعہ

ابھی عود ہندی طبع ہونے نہ پائی تھی کہ اطراف ہند سے میرزا صاحب کے مجموعۂ خطوط کی مانگ شروع ہوگئی۔ میرزا صاحب نے بیخبر کو اُن کے مرتب کردہ مجموعے کی طباعت کے متعلق بار بار لکھا، اور جب سال بھر

گزرنے لگا اور کسی طرح کتاب نہ چھپی، تو انھیں اس کی طباعت کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ احباب دہلی نے میرٹھ کے کارپردازوں کا تساہل دیکھ کر اس شرف کو خود حاصل کرنے کا تہیہ کیا، اور مالک اکمل المطابع دہلی کو، خراجات طباعت برداشت کرنے پر آمادہ کیا۔ اب خطوط کی فراہمی کا مسئلہ باقی رہتا تھا۔ وہ اس طرح حل ہو گیا کہ خود میرزا صاحب جو اپنی انشا کی حقیقی قدر و قیمت اور بازاری مانگ سے باخبر ہو چکے تھے، اس میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چاروں طرف اصل خطوط یا ان کے نقول کی طلب میں خطوط لکھے گئے، اور رفتہ رفتہ کافی ذخیرہ اہم ہو گیا۔ اس سلسلے میں خود میرزا صاحب نے جن احباب کو لکھا ان میں سے ہنجر اور علائی کے متعلق دستاویزی ثبوت موجود ہے۔ بقیہ اصحاب سے میرزا صاحب کے تقاضائی خطوط کی نقلیں نہیں بھیجیں، اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون بزرگ تھے، جنھیں خود میرزا صاحب نے ارسالِ نقول کے لیے لکھا تھا۔ ہنجر کے نام کا خط پہلے باب حاشیے کی مانگ کے تحت درج ہو چکا ہے، علائی کو سب سے پہلا مکتوب ان کے لوہارو پہنچنے کے بعد لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں، مجھ سے مسودات مانگے ہیں، اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا، جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہو، وہاں بھیجدیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیجدوگے، یا آج کل میں کوئی ادھر آنیوالا ہو، اس کو دیدوگے، تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔ اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے

جانے سے تم بھی خوش ہوگے "(۱)

اس خواہش کی تکمیل میں علائی نے پس وپیش کیا۔ میرزا صاحب نے سمجھا کہ غالباً نواب صاحب نجی معاملات کی اشاعت کے خیال سے گریز کر رہے ہیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ قبل خود میرزا صاحب نے تفتہ کو یہ لکھکر اشاعت خطوط سے روکا تھا کہ نجی واقعات کو منظر عام پر لانا کیا ضرور ہے، لیکن اب انکا ادبی عقیدہ بدل چکا تھا، اس لیے نواب صاحب کے اس خیال کی تردید میں تحریر کیا:

"میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ نے تم نے لکھا، تمہارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا، میں سخت بے مزہ ہوا۔ اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں، تو شاید ایک تختہ کاغذ سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو، اور شہرت تمہارے منافی طبع ہے، تو ہرگز نہ بھیجو۔ وقصہ تمام ہوا۔ اور ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے، تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو، اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر جیسا ہو کسی کے ہاتھ چاہو۔ بھیج یا رسل ارسال کرو، لیکن جلد۔ خدا کے واسطے کہیں غصے میں آکر "عطائی تو بلقای تو"، کہکر اصل خطوط نہ بھیج دینا، کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے "(۲)

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد بھی علائی نے ارسال نقول میں توقف کیا تھا، مگر میرزا صاحب نے پھر اس کے متعلق کچھ نہ لکھا، اور جب انھوں نے اصل خطوط بھیجکر میرزا صاحب کے ترک طلب کا سبب دریافت کیا، تو صبح شنبہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۶۳ء کو از راہ معذرت لکھا:

"لا موجود الا اللہ! اس خدا کی قسم، جس کو میں نے ایسا مانا ہے، اور

---

(۱) اردو ی ص ۱۹۸ (۲) ایضاً ص ۲۲۳۔

اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانتا ہے، کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے اپنا نفع نقصان سوچے گا، لاگت سپٹا کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا، اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ ۴۲ رقعے ایک جگہ سے لیکر اُن کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً اُنھوں نے طلب رقعات بہ تکلیف سوداگر لکھی، اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لیکر کہیں گیا ہو گا۔ یا کتابیں لینے گیا ہو گا۔ یہ ۲۳ لفافے اور ۴۳ خط بدستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے اگر متوسط بتقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا، ورنہ تمھارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔"[1]

غالباً اس خط کی روانگی کے بعد ہی مہتمم مطبع نے خطوط کی نقلیں حاصل کر لیں میرزا صاحب یکشنبہ ۳۰ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۰ ۲۱ جون سنہ ۱۸۶۳ء اصل خطوط واپس کرکے لکھتے ہیں:

"میری جان! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمھارے یک مشت اُن کو دیے۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے، رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔"[2]

اردوی معلی

خطوط کا یہ پہلا مجموعہ اردوی معلی کے اسم سے موسوم ہوا۔ مجروح نے اس کا دیباچہ اور سالک نے اس کا خاتمہ لکھا۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہوئی۔ پہلے حصہ میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے

---

(۱) اردوی معلی: ۴۰۴، ۴۲۲ (۲) ایضاً: ۴۰۸۔

تا طلبائی مدرسہ فائدہ اُٹھائیں، دوسرے حصے میں مطالب مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی ۱؎ غالباً پہلی بار صرف حصہ اول شائع ہو سکا، اس لیے کہ کتب خانۂ عالیہ رامپور میں جو نسخہ موجود ہے، وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصہ اول پر مشتمل ہے۔

اردوی معلی کا سال طباعت

لہٰذا ہر یقین کرنے کے تمام وجوہ موجود تھے کہ خطوط کا یہ مجموعہ جلد از جلد شائع ہو گا۔ لیکن قدرت نے اس ادبی انقلاب کی اولیت کا شرف میرٹھ ہی کو ودیعت کیا تھا۔ عود ہندی ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ھ کو شائع ہو گئی، اور اردوی معلی میرزا صاحب کے انتقال کے ۱۹ دن بعد، ۲۱، ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ (۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء) کو چھپ کر تیار ہوا۔ ۲؎

سالک نے سالِ طبع لکھا:

کیا کہوں کچھ نہیں جاتا	لب پہ نالوں کا ازدحام ہوا
صدمۂ مرگ حضرت غالب	سبب رنج خاص و عام ہوا
ہے یہی سالِ طبع و سالِ وفات	آج اُن کا سخن تمام ہوا

۱۲۸۵ھ

مقام طباعت اور حق تصنیف

اردوی معلی، دلی کے مطبع اکمل المطابع میں طبع ہوا۔ حکیم غلام رضا خاں اس کے مالک، میر فخر الدین مہتمم، اور لالہ بہاری لال منشی تھے ۳؎

کتاب کے آخر میں ایک اعلان شائع ہوا کہ اس کا حق تصنیف میرزا صاحب نے حکیم غلام رضا خاں کو عطا کر دیا ہے، اور ایک رقعہ بطور سند لکھ دیا ہے، لہٰذا کوئی صاحب حکیم صاحب کی بلا اجازت رقعات چھاپنے کا قصد نہ کریں۔ اس کے بعد میرزا صاحب کی حسب ذیل تحریر چھپی:

"پیکر بے روح و رواں، فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص بہ ہیچمدان کہتا ہے

۱؎ اردوی: ۵، ۴۰، ۲؎ ایضاً: ۵۸۰، ۳؎ ایضاً: ۵ دکمالہ

"اور لکھدیتا ہے کہ یہ چار اردوی معلی تصنیف فقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے ازراہِ فرطِ محبت اپنا حق تالیف نورچشم اقبال نشاں، حکیم غلام رضا خاں کو بخشدیا ہے اور اس حق کو خاص اُن کا حق کیا۔ اب اور کوئی صاحب اگر مالکِ اکمل المطابع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع اردوی معلی کے چھاپنے کا قصد کریں گے، تو مواخذے سے محفوظ نہ رہیں گے، اور فوراً حسب منشاء قانون بستم سنہ ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔ (مہر نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۷۷ھ)"

اردوی معلی کا پہلا ایڈیشن

اردوی معلی حصۂ اول کا پہلا ایڈیشن ۴۴۶ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں ۵ صفحے مجروح کے دیباچے کے ہیں۔ پانچویں صفحے کی پندرھویں سطر سے خطوط شروع ہو کر صفحہ ۴۵۸ کی تیرہویں سطر پر ختم ہوتے ہیں، اور باقی چار سطریں خاتمۃ الطبع پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۴۵۹ سے ۴۶۱ کی ساتویں سطر تک سالک کا خاتمہ ہے۔ اس کے بعد جوہر کی تاریخ طبع ہے، اور پھر اسی صفحے کی گیارہویں سطر سے صفحہ ۴۶۴ کی تیرہویں سطر تک تصحیح اغلاط کا نقشہ ہے۔ بعد ازاں میرزا صاحب کا اعلان عطیۂ حق تالیف ہے کتاب خانۂ رامپور کے نسخے کے شروع میں زرد رنگ کا سرورق تھا(۲) یہ میرزا صاحب کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا، اس لیے اس میں انھیں مرحوم نہیں لکھا گیا ہے۔

رقعات کی تعداد

اردوی معلی کے اس ایڈیشن کے رقعات کی کل تعداد ۴۷۰ ہے

---

(۱) اردوی: ۴۴۶ (۲) ڈاکٹر صدیقی صاحب (الہ آباد) کے پاس اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور دونوں کی لوح گہرے سبز رنگ کے کاغذ کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوح کے لیے مختلف رنگوں کے کاغذ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ان میں ۱۰ نواب میر غلام بابا خاں بہادر کے نام، ۹ ۲ سیاح کے نام، ۲۰ ذکا کے نام، ۹۸ تفتہ کے نام، ۳ شاہزادہ بشیر الدین صاحب بہادر کے نام، ۵ سید بدرالدین المعروف بہ فقیر کے نام، ۱۷ سرور مارہروی کے نام، ۲ میر سرفراز حسین کے نام، ۳۹ مجروح کے نام، ۲ شاہ عالم صاحب کے نام ۲ صاحب عالم کے نام، ۱ نساخ کے نام، ۱ عزیز کے نام، ۱۱ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام، ۲ رعنا مرادآبادی کے نام، ۲ شاکر کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام ۱ مفتی سید عباس کے نام، ۲۳ حکیم غلام نجف خاں کے نام، ۱ نجم الدین حیدر خاں کے نام، ۵ وفا کے نام، ۲ مولوی احمد حسن قنوجی کے نام، ۱ حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام، ۱ تفضل حسین خاں کے نام، ۱۸ قہر کے نام، ۲ منشی نبی بخش کے نام، منشی عبداللطیف ابن منشی نبی بخش کے نام، ۱۲ ہجر کے نام، ۱ نیر کے نام، ۷ مرزا شہاب الدین احمد خاں کے نام، ۱۹ شفق کے نام، ۳ میرن صاحب کے نام، ۲ سالک کے نام، ۲ رضوان کے نام، ۲ کامل کے نام، ۴ حسین مرزا کے نام، ۱۲ یوسف مرزا کے نام، ۳۳ منشی شیو نراین کے نام، ۲ بابو ہر گوبند سہائی کے نام، ۲ نواب امین الدین احمد خاں بہادر کے نام، ۵۶ علائی کے نام ۱۰ فرخ مرزا کے نام، ۲ میکش کے نام، ۱ حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام، ۱ حکیم غلام رضا خاں کے نام، ۳ ماسٹر پیارے لال کے نام، ۲ جوہر کے نام منشی ہیرا سنگھ کے نام، اور ۲ مشتاق کے نام ہیں۔

اردوی معلی حصۂ دوم

غالباً میرزا صاحب کے یکایک انتقال کے صدمے نے مہتممین اشاعت اردوی معلی کو حصہ دوم کی ترتیب و طباعت کی طرف سے برداشتہ خاطر کردیا، اور یہ حصہ دیباچے کے وعدے کے باوجود شائع نہ ہوسکا سنہ ۱۸۹۹ء میں مولوی عبدالاحد مرحوم، مالک مطبع مجتبائی دہلی نے اردوی معلی کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ خواجہ حالی مرحوم نے حصہ دوم کے لیے

کچھ مواد عطا فرمایا، جو مہتمم طباعت نے حصہ دوم کے نام سے آخر میں شامل کر دیا۔ خود عبدالاحد مرحوم کے الفاظ میں: "اس حصے میں خاصکر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (میرزا صاحب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں"

چونکہ مجروح نے بھی تقریباً اسی قسم کے خطوط مرتب کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے کچھ بعید نہیں ہے کہ مجروح کا ذخیرہ خواجہ صاحب کو مل گیا ہو، اور مہتمم مطبع نے اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر کتاب چھاپ دی ہو۔

نسخۂ مجتبائی کا حصہ دوم ۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں، سطروں کا ایک مختصر تقریبی نوٹ ہے۔ اس کے بعد سراج المعرفت اور حدائق الانظار کے دیباچے ہیں۔ بعد ازاں شاہ ظفر کی ایک کتاب اور سرور کی گلزار سرور کی تقریظیں ہیں۔ ان کے بعد دیوان ذکا، میرزا کلب حسین خاں نادر بنارسی کی ایک کتاب، نیز رسالہ تذکیر و تانیث مصنفۂ عظیم بلگرامی کے دیباچے ہیں۔ یہ تمام دیباچے اور تقریظیں صفحات ۱-۱۳ پر درج ہیں۔ ان کے بعد اسی صفحے سے اصلاحی خطوط شروع ہوتے ہیں، جن میں ۴۳ خطوط تفتہ کے نام، ماسٹر پیارے لال کے نام، ۵ ذکا کے نام، ۵ سیاح کے نام، ۲ شاہزادہ بشیر الدین کے نام، ۱ ہشیار کے نام، ۱ مولوی کرامت علی کے نام، ۱ جوہر کے نام، ۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، اور ۲ مجروح کے نام ہیں۔

ضمیمۂ اردوئ معلی

سنہ ۱۲۲۹ء میں شیخ مبارک علی صاحب، تاجر کتب لاہور نے اردوئ معلی کے حصہ اول و دوم کے نسخے خوش نما مرتب کیا ہوا ایک ضمیمہ بھی

شائع کیا ہے ۔ یہ ۲۳ خطوط پر مشتمل ہے، جن میں سے ۲۲ قدر بلگرامی کے نام، اور ایک شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام خطوط مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی نے مولانا حسرت موہانی کے ماہانہ رسالے "اردوی معلی"، علیگڑھ، کے دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کے پرچے میں شائع کیے تھے ۔ سر خوش نے اس پرچے کے حوالے بغیر خطوط نقل کر دیے ہیں ۔

اس ضمیمے کے آغاز میں دو خط اور شامل کیے گیے ہیں، جو شیخ صاحب کو شفیقِ مکرم آقا محمد باقر، نبیرۂ حضرت آزاد دہلوی، سے دستیاب ہوے تھے ۔

میرزا صاحب کے خطوط کا آخری مجموعہ، مکاتیب غالب

مذکورہ بالا مجموعوں کی اشاعت سے ساٹھ پینسٹھ برس بعد ریاست عالیۂ رامپور کی طرف سے میرزا صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ مکاتیبِ غالب کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، جو موصوف نے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں یا وابستگانِ دربار کو لکھے تھے ۔

سرکارِ رامپور سے میرزا صاحب کی مراسلت بارہ سال تک جاری رہی ۔ اس عرصے میں اہلِ رامپور سے بھی اُن کے خلصے تعلقات قائم ہو گیے تھے اور متعدد اصحاب سے خط کتابت بھی رہتی تھی ۔ لیکن سوءِ اتفاق سے اُس کی مراسلت کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا ۔ اس مجموعے میں صرف وہ خط مرتب کیے گئے ہیں، جو دار الانشا میں محفوظ تھے ۔

مکاتیب کی تعداد

مجموعۂ ہذا کے مکاتیب کی تعداد ۱۱۲ ہے اُن میں سے ۴۳ خط نواب فردوس مکاں کے اور ۶۷ نواب خلد آشیاں کے حضور میں

چھپے ہوئے تھے، بقیہ میں سے ۲ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام، ۲ صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بیتاب کے نام، ۲ منشی سیلچند میر منشی کے نام، ۱ خلیفہ احمد علی احمد رامپوری کے نام، اور ۱ مولوی محمد حسین خاں، مدیر دبدبۂ سکندری، کے نام ہے۔

نواب فردوس مکاں کے نام کے خطوط میں، ۴ فارسی زبان کے اور بقیہ ۹۳ اردو کے ہیں۔ اور چونکہ مجموعے میں ایک فارسی قصیدہ مستقل نمبر کے تحت درج ہوا ہے، بنابریں ان کے نام کے خطوں کی تعداد ۹۸ اور کل مکتوبات کا شمار ۱۳۰ ہو گیا ہے۔

گم شدہ خطوط کی تعداد

نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے فرامین کے مسودوں نیز مرزا صاحب کے زیرِ نظر مکاتیب میں تقریباً ۱۳۵ ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں جو مثلوں میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے، تو مکاتیب غالب کی تعداد ۲۶۴ ہوتی، جو اور بڑھ جاتی، اگر اُن کی اہلِ شہر سے خط کتابت بھی دستیاب ہو سکتی۔ لیکن

در دستِ دیگر یست سفید و سیاہ ما



مکاتیب غالب

متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بحضورِ نواب صاحبِ والا مناقبِ عالی شان، قلزمِ فیض و عمانِ سان، جنابِ نواب محمد یوسف علی خان بہادر دام اقبالہ مقبول باد"

[نواب سید یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، طاب ثراہٗ، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، ابن نواب سید علی محمد خاں بہادر بانیِ ریاست روہیلکھنڈ کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فتح النسا بیگم صاحبہ، بنتِ محمد نور خاں بڑہیچ، ہمشیر زادۂ نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، کے بطن سے دوشنبہ ۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۳۱ ہجری (۵ مارچ سنہ ۱۸۱۶ء) کو متولد ہوئے، اور دوشنبہ ۱۳ رجب سنہ ۱۲۷۱ ہجری (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کو مسندِ حکم رانی پر قدم رکھا۔ جلوس کے دو سال دو ماہ بعد ۱۴ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ (۹ مئی ۱۸۵۷ء) کو مشہور واقعۂ غدر رونما ہوا۔ آپ نے اِس فتنے کے فرو کرنے میں حکومتِ ہند کی اعانت کر کے، بسلسلۂ اعترافِ خدمات بیس ہزار روپیہ کا خلعت، ایک لاکھ بیس ہزار روپے سالانہ آمدنی کا جدید علاقہ، اور "فرزندِ دلپذیرِ دولتِ انگلشیہ" کا خطاب حاصل کیا، سلامی گیارہ ضرب توپ کے بجائے تیرہ ضرب مقرر کی گئی، اور مراسلت میں القاب و آداب "نواب صاحبِ مشفق بسیار مہربان کرم فرمای مخلصان سلامت، بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرت آیات مشہودِ خاطرِ الطاف ذخائر مہر اہد" طے پایا۔ آپ نے خود اس عطیے کی

درش را بود پایه در خیالم — نگه سویش از دور پنهان فرستم
کلیم، ار عصا ارمغانم فرستد — من این ارمغان بهر دربان فرستم
وجودش بود فخر اجرام و ارکان — تحیّت باجرام و ارکان فرستم
ز جودش، بود وعده بازیردستان — بشارت به برجیس و کیوان فرستم
ز خویش، نسیمی به جنّت رسانم — ز کویش، نسیمی به رضوان فرستم
هم از شرقِ اشراقِ دی، آفتابی — باختر شناسانِ یونان فرستم
هم از روی نیکوی دی، ماهتابی — بر شب زنده دارانِ کنعان فرستم
اگر بگذرد تیرِ شش از سینهٔ من — دل از سینه همراهِ پیکان فرستم
وگر سر ازین راه دزدد جبین را — چو گویش درین ره بچوگان فرستم
سرشت از خزانست بدخواهِ او را — سه فصلِ دگر هم بدیشان فرستم
هم از آتش دوزخ آرم تموزش — هم از زمهریرش زمستان فرستم
وگر تا بهاران بسختی نه میرد — در اُردی بهشتش بزندان فرستم
سپه چون کشد، گر نه از ناتوانی — توانم که خود را بمیدان فرستم
درین ایزدا، از نفس های گیرا — به رایات، آیات قرآن فرستم
تو بخشی فضلِ حق، آن عینِ معنی — که "آباد" بر روی فراوان فرستم
گزشت اندر اندیشه کز خامه ریزی — بدان قلزمِ فیض و احسان فرستم
بدل گفتم، البته کاریست مشکل — نشاید که این نامه آسان فرستم
سگالش چنین رفت در کار سازی — که فرخ بود، چون بفرمان فرستم
فرستادم، اما نیابد جوابی — که تا هرچه فرمان رسد، آن فرستم
ندانم که شورِ فغانِ گدا را — چسان باز تا گوشِ سلطان فرستم
بدل گفتم، آری، فرستاده باشم — گر از راهِ چاکِ گریبان فرستم
دگر جادهٔ ره شناسان نه گردد — هم از جیبِ چاکی بدامان فرستم
بدان تاروائی دهم کارِ خود را — ز خونابه موجی بمژگان فرستم

دمم در تنِ نی دمِ آتشین را | فروزنده شمعی به ایوان فرستم
برفتارِ ناز اندر آیدم قلم را | تذروی به صحنِ گلستان فرستم
سخن کوته، آن به که از نظمِ خردی | به دیوانِ آن صدرِ گیهان فرستم
فرستم ولیکن خرد چون پسندد | که برگِ گیاهی به بستان فرستم
گرفتم که رنگین خیالم به گیتی | شقائق به بنگاهِ نعمان فرستم
گرفتم که سحر روانم به معنی | گهر جانبِ ابرِ نیسان فرستم
گرفتم که روشن روانم بدانش | چراغی به مهرِ درخشان فرستم
درین پرده خواهم که از مورِ مسکین | سلامی بسوی سلیمان فرستم
نبشتم که خدمت گزارست غالب | پیِ دعوئِ خویش برهان فرستم
بشب بستم این نقش و در بند آنم | که حرزِ دعا بامدادان فرستم
بقا، بهرِ داور، ز دادار خواهم | "به آمین" خروش از سروشان فرستم[1]

(۳)

بحضورِ پُرنور، حضرتِ نوابِ معلّی القاب، جاودان کامیاب، ولیِّ نعمت، آیۂ رحمت، دامَ اقبالُهٗ، سپاس بجا می آورد و پوزش همی گسترد، آن بارگاهِ سپهر کارگاه را قبلۂ حاجات میداند، و بهنجارِ سرگذشت حکایتی بعرض میرساند. سه شنبه، ۲۰ جنوری نامۂ مولنا و بالفضل اَولٰنا[2] بمن رسید. چهارشنبه ۲۸ جنوری عرضداشت روان داشتم. چون دو هفته گذشت و سررشتۂ ڈاک درین بندوبستِ جدید استوار نماند[3]، گفتم "مگر نرسیده باشد". دی که چهارشنبه یازدهم فروری ۱۸۵۷ بود، چاشتگاه قصیدهٔ[4] بقصدِ اظهارِ فرمان پذیری فرستادم. شامگاه سرهنگِ یام منشورِ عطوفت آورد. بر مردمکِ دیده سُودم و خردۂ جان نثار کردم. تا نورد از هم کشودم، دو ورق از فهرستِ گنجینۂ اسرار یعنی اوراقِ اشعارِ گهربار و سفتچۂ[5] دوصد و پنجاه روپیه در آن نورد یافتم. دفترِ شعر سجلِ اعتبارِ من شد، و زرِ آن سفتچه بمعرضِ وصول آمد. کرم در بنده پروری بهانه میجوید، ورنه این

افتتاح بشیرینی نیاز نداشت۔ کریمان بندہ را بہ نمک ہمی پرورند؛ ولی نعمت را بندہ بشکر پروردن آئین است شکر این شکر بعہدۂ جانِ شیرین فرد گزاشتم، این نامہ بہر آنکہ رسیدنِ عطیہ حالی گردد، بدین زودی نگاشتم۔ اشعار خود بہنگام خویش خواہد رسید و این سررشتہ ہیچگاہ از ہم نخواہد گسست۔ زیادہ حد ادب۔ نیرِ دولت و اقبال سرچشمۂ فروغِ بی زوال باد!

غالب

پنجشنبہ ۱۲ فروری ۱۸۵۷

(۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر[1] حضور میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دیے ہیں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے، تو میں پھر اُس[2] کو صاف کر کر بھیجدوں؛ ورنہ موقع حکّ و اصلاح مجھے کیا یاد رہے گا۔[3] فقط

میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیسان، ان میں سے جو پسند آئے، وہ رہنے دیجئے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر یہی تخلص منظور رہے، تو بہت مبارک۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب، غالب۔ روزِ یکشنبہ ۱۵ فروری سنہ ۱۸۵۷[4]

[میرزا صاحب نے ۸ مارچ ۱۸۵۷ء کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۱۱ ماہِ مذکور کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا صرف لفافہ شامل ہے، اور اُس کی پشت پر تحریر ہے: "عرضی حسب الحکم چاک نمودہ شد۔ ۱۶ رجب ۱۲۷۳ھ"

میرزا صاحب نے یکم اپریل سنہ ۱۸۵۷ء کو ایک اور عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۳۔ اپریل کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا بھی صرف لفافہ شامل ہے اور اُس کی

پشت پر تحریر ہے: "عرضی از دستِ مبارک چاک شد، و بندِ غزلیاتِ مرسلہ در حضور ماند۔ ۹ شعبان سنہ ۱۲۷۳ ھ۔"

(۵)

جنابِ عالی، کچھ کم مہینا ہوا کہ میں نے حضور کی غزلوں کو دیکھ کر خدمت میں روانہ کیا ہے، اور اُس[1] کے پہنچنے سے اطلاع نہیں پائی۔ اب ڈاک میں خط تلف بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس واسطے میں متردد ہوں، اور مدعا اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر وہ لفافہ نہ پہنچا ہو، تو میں اُس مسوّدے کو پھر صاف کر کر روانہ کروں۔ زیادہ حدِّ ادب۔ از غالب۔ نگاشتۂ صبح پنجشنبہ، ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۷۳ ہجری[2]

(۶)

جنابِ عالی، آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ اُجورہ دار پہنچا۔ مگر لُٹا ہوا، اور بھیگا ہوا، اور بھاگتا ہوا۔ گوجروں نے اُسے لُوٹ لیا۔ روپیہ کُل سب لے لیا۔ خط اُس دار و گیر میں گر پڑا، بھیگ گیا۔ لفافہ مجھ تک نہ پہنچا، خط مع ہنڈوی کے پہنچا۔ خط میں سے القاب بہ تکلف پڑھا، اور یہ جملہ "سفتۂ مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ" پڑھا گیا، اور باقی خیر و عافیت "مگر نہ آنکہ" اس کے بعد جو کچھ لکھا تھا، اُس میں سے "مولوی" یہ لفظ، اور بعد ایک لفظ کے "خانصاحب" یہ پڑھا گیا، اور کچھ نہیں۔ مجھ کو[4] غم یہ ہے کہ غزلہای اصلاح اور "دیوانِ اُردو" کی رسید میں نے نہ پائی[5]۔ فقط

ہنڈوی کا بِعَینِہٖ وہ حال جو میرے خط کا تھا، کچھ پڑھا جائے، کچھ نہ پڑھا جائے۔ آپ کا نام اور ڈھائی سو روپیہ پڑھا گیا۔ چونکہ مہاجن مجھ کو جانتا تھا، اُس نے اُس بھیگے ہوئے کاغذ کو اپنی چِٹھی میں لپیٹ کر اُس مہاجن کے پاس بھیجا ہے۔ جب وہ صحیح کر کر بھیجے گا، تب وہ مجھ کو روپیہ دیگا۔ اُس کے صحیح کرنے میں کیا تامل ہے؟ میں نے صرف بطریقِ اطلاع لکھا ہے۔ اور غزلوں کی اور دیوان کی رسید، اور جو اس خط میں "مگر نہ آنکہ (کے)[6] بعد مطالب مندرج تھے وہ پھر لکھیے

ہی باریک کاغذ پر لکھ کر اُس (۱) ساہوکار دیجیے گا، اور اُس کو تاکید کیجیے گا کہ اس
کو بھیجدے۔ یہاں کے ساہوکار نے میری خاطر سے اس رقعے کو اپنی (۲) بھیج
میں روانہ کیا ہے۔ غالب پنجم ذی الحجہ (۳)

(۷)

بوالاخدمتِ رفعت درجت، جنابِ نواب صاحبِ والامناقبِ عالیشان
قلزمِ فیض و محیطِ احسان، عزّ نصرہٗ وَ دَامَ مُلکُہٗ، آدابِ نیاز بجا می آرد، و
نیاز مندانہ عرضہ می دارد۔ درزمانِ چیرہ دستیٔ کورنمکانِ سیاہ رُو سیاہ سرشتہ
پیام از ہم گسست۔ ناچار بفرستادنِ نامہ بر، رساندنِ نامہ و پیام صورت بست
درین روزگار کہ فرمانِ داورانِ دادگر روائی و سلسلۂ آمد شدِ نامہ رسائی یافت،
نامہ در پیام روان داشتہ شد، و نارسیدنِ پاسخ آن را چنان پنداشتہ شد، کہ
مگر آن نیاز نامہ نرسیدہ باشد، یا فرطِ احتیاط مانعِ تحریرِ جواب گردیدہ باشد۔ ہر
آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بار بد انسان سخن سرای نوان گشت کہ سرگزشت
من از ولی نعمت نہان و حجابی در میان نماند۔
حالیُ رای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمکخوارِ سرکارِ انگریزم، واز سرآغازِ سالِ یکہزار
وہشت صد و شش کہ دران گاہ شمارِ سنینِ عمرِ من از دہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عم
حقیقی نسبیٔ خود، نصراللہ بیگ خان بہادر (۴) کہ با جمعیتِ رسالۂ چہارصد سوار معیت
جرنیل لارڈ (۵) لیک بہادر (۶) در فتحِ ہندوستان کوششہای نمایان کردہ، و پرگنہ
"سونک سونا (۷)" بقیدِ حینِ حیات جاگیر یافتہ، و ہمدران عہد بمرگِ ناگاہ ازجہان
رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوریٔ گورمنٹ، مُثبتِ زرِ نقدِ سالانہ
جاگیرِ عم نسبیٔ من، نوابِ احمد بخش خان بہادر (۸) در وجہ معاشِ من منجملۂ نذرِ استراری
سرکاری کہ بذمۂ نوابِ احمد بخش خان بہر دوام واجب الادا بود، قرار یافت
چون جانشینِ احمد بخش خان (۹) کیفر کردار یافت، و جاگیر بسرکار باز یافت شد،
رسیدنِ آن وجہ مقرری از خزانۂ کلکٹری (۱۰) دہلی صورت پذیرفت، چنانکہ تا انجام

اپریل سنہ ۱۸۵۷ء از کلکٹری دہلی یافتہ ام، و از مئی خود آشکار است کہ حالِ چلیست۔ پیوندِ تعلق با بہادر شاہ[1] جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بتحریر تاریخ سلاطین تیموریہ و از دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریار می پرداختم۔ درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدین اندیشہ کہ مباد، اگر یاب قلم ترک آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔ ہرگاہ شہر بدستِ سپاہِ انگریز فتح شد، ہمہ جاگیرداران و پنشنداران[2] از شہر بدر رفتند، چنانکہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند، من از جا نجنبیدم و ہم چنان گوشہ گیر ماندم۔ درین بندوبست کہ خاصہ از بہرِ سیاستِ مجرمان ست و تحقیقاتِ جرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مخبران می کنند، ہیچ گونہ آلایشِ دامن من پدید نیامد و دار و گیر و باز پرس رو نہ داد[3]۔ بودنِ من در شہر از حکّام نہان نیست۔ امّا چون پرسشی درمیان نیست، لاجرم محفوظ ماندہ ام۔ می بایست کہ خود سلسلہ جنبان گشتمی و با حکّام پیوستمی، درین بارہ سخن آنست کہ درین فرماندہان باہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم، و معہذا ہنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم[4] و خواہشِ ملاقات بمیان آورم۔ رستی، اینکہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام۔ لیکن مقامِ شکر است کہ تبقدیم نرسیدنِ خدمت از راہِ بیدستگاہی است، و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہمان بیگناہی است۔

حالِ خود را، اگرچہ پرسش از جانبِ آن والا مناقب نبود، گفتم[5] و خون میخورم کہ صحت و عافیتِ ذاتِ ہمایونِ اقدس کہ یا۔ب، جاودان سلامت باد! چگونہ دریابم۔ ہمدرین کنج کہ مسکنِ منست، شنیدہ ام کہ والاشان زین العابدین خان بہادر[6] بشہر آمدہ اند۔ نیازمندیٔ من باہر حومی نواب عبداللہ خان بہادر[7] و مہر دریٔ من با اصغر علی خانِ مرحوم[8] و محبت و ملّتِ من با نواب عبدالرحمن خان بہادرِ مغفور[9] کجا دیدہ اند و آن مدارج کی در نظر دارند، کہ ایشان را در ضمیر میگذشتے کہ گدائی گوشہ نشین را باید دید؟ من خود پائی کہ رفتار داشتہ باشد ندارم

دارم دادیه بردن آمدن نتوانم۔ بہ نگاشتنِ این نامہ زحمتِ اوقاتِ ملازمان
ازآن روا داشتہ ام کہ اگر نفرستادنِ نامہ محض از روی احتیاط است،
ہویدا گردد کہ در عنایت تفریط و در رعایت افراط است۔ چشم دارم کہ بمشاہدۂ
سوادِ نوازشنامہ فروغ نظر اندوزم۔ بشغلِ شعر و سخن ہر آئینہ اشتغال دارم کہ درین
چنین فتنہ و آشوب دل بدان کار چگونہ گراید؟ دولت پایندہ و نصرت طرب
فزایندہ باد! از اسداللہ غالب، نگاشتہ و روان داشتہ پنجشنبہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۸ء

لہٗ[۱]

دبیرانِ خاص، برعنوانِ نامہ ہا چنین، نشانِ کلبۂ این درویش دلریش
عقبِ مسجدِ جامع نبشتہ اند، ومن از ہشت سال در محلۂ بلی ماران[۲] می
مانم۔[۳] سپس نشانِ این محلّہ نگاشتہ شود۔ فقط

(۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت![۴]

منشورِ عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی مخمس اور
غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی۔

یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کرنا ہے، ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح
کی احتیاج کیا ہے؟ میری کیا سخنوری اور سخن سرائی ہے! آپ کی قدردانی
بلکہ قدر افزائی ہے۔ تکلف ہے، اگر کہوں کہ "تا قیامت رہو۔ بے تکلف
دعا یہ ہے کہ خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو!

اِس قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی کے اُن کا ملاحظہ نہ کرنا مرقوم ہوا،
دیکھنے کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔ دیوان کے دیکھنے نہ
دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے۔ مگر یہ چار جزو کا رسالہ جو اب بھیجا ہے، اِس کا
دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسیِ قدیم اور پھر حُسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ؛
باایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور عبارات کا لحاظ۔

جنابِ عالی، طُرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ ہے۔ خدا کا شکر یہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جُرم کا شبہ میرے احتمال بھی نہیں! قسمت کا گلہ یہ کہ عطای پنشنِ قدیم کا حکام کو خیال ابھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اُنیسواں مہینا ہے۔ گویا بِن کھائے جینا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشنداروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیے کیا نیا گُل کھلے گا! پہلی نومبر کو یہاں اشتہارِ عام ہو گیا ہے، کہ اب قلمروِ ہندوستان میں عملِ ملکۂ معظمہ عالی مقام ہو گیا ہے[۲]۔ میں پہلے سے مدّاحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرای ملکۂ دارا دربان کے دو سارٹی فکٹ[۳] پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے، تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے۔ خوشنودی کا طالب، غالب۔ نگاشتۂ روزِ یکشنبہ ہفتم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء

(۹)

خداوندِ نعمت سلامت![۴]

جو آپ بِن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بارِ گرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگدست تھا، اب تہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے، اور کچھ بھجوا دیجیے۔ عنایت کا طالب غالب

چار شنبہ یازدہم ربیع الثّانی سنہ ۱۲۷۵ ہجری و ۱۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء[۵]

(۱۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد آدابِ بجا لانے کے عرض کرتا ہوں کہ منشورِ رافت لکھا ہوا ۲۵ نومبر کا جمعے کے دن تیسری دسمبر کو اس دعاگوی دولت کے پاس پہنچا۔ ڈھائی سو روپیے کی ہنڈوی معتمد کے حوالے کی گئی۔ آج یا کل روپیہ آجائے گا۔ خاطر عاطر اقدس جمع رہے۔[۲]

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں تک آؤں تو کیونکر؟
کہاں جاؤں گا؟ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اس کو چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے، اور انگریزوں سے بھی سنا ہے کہ آغازِ سالِ ۹۰ عیسوی میں یہ قضیہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اُس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اُس کو جواب مل جائے۔

حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلامِ خوش مطلوب ہے، اگلی غزلوں کی طرح خوشنوال؟ اگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی، اور اُن اشعار میں کلامِ خوش نہ تھا، تو ان غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اردو کے دیوان بھر میں ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔ میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی قصور نہیں کرتا۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشت غالب۔

۲۲ ربیع الثانی سنہ ۷۵، ۳ دسمبر ۵۸ء

(۱۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

میں اس دولتِ ابدمدت کا از راہِ مودت خیر خواہ ہوں۔ امرِ ملال انگیز اندوہ آور میں آرایشِ گفتار گوارا نہیں کر سکتا۔ نواب مرزا نے دلّی آکر پہلے تو یہ بزم آرائی سنائی ہے۔ جاتا تھا کہ اُس کی تقریب لکھوں، کل اُس نے از روی خطِ آمدۂ رامپور حضرت جنابِ عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا! حضرت کے محزون ہونے کا تصور کر کر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بیدرد نہیں ہوں کہ ایسے مقام پر بطریقِ انشاپردازی عبارت آرائی کروں؛ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانادلِ دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں ؎

از دستِ گدای بی نوا ناید ہیچ   جز آن کہ بصدقِ دل دعائی بکند

حق تعالیٰ ذاتِ ستودہ صفات کو دائماً اور ابداً جاہ و جلال و دولت و اقبال کے ساتھ سلامت با کرامت رکھے!

عریضہ نگار، اسد اللہ المتخلص بہ غالب

مرقومۂ یکشنبہ ۲۱ شعبان و ۲۷ مارچ سالِ حال

(۱۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

ایک خط مشتمل اپنے حال پر[1] اور ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلۂ مغفورہ کی تعزیت میں روانہ[2] کر چکا ہوں۔ اب ایک قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ایک کا تعمیہ ہے، لیکن تعمیہ کتنا خوب اور بے تکلف ہے!

عرضداشتِ اسد اللہ۔ معروضۂ ۱۳ رمضان و ۱۷ اپریل سالِ حال[3]

جنابِ عالیہ از بخششِ حق — بہ فردوسِ بریں چون کرد آرام

سخن پرداز غالب سالِ رحلت — "خلود خُلد" گفت از روی الہام

(۱۲۷۵ھ)

(۱۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں۔ آج دوشنبے کا دن ۱۴ رمضان المبارک کی اور ۱۸ ماہِ اپریل کی صبح کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور منشورِ عطوفت لایا۔ میں نے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ تعجب ہے کہ میرے دو خطوں کی رسید اس عنایت نامے میں مرقوم نہیں۔ آیا نہ پہنچے، یا پہنچے اور نہ پڑھے گئے، کچھ معلوم نہیں۔

پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پسنداردوں کی مثل مرتب ہے اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر[4] نے کلکتے سے میرے پنشن کے کواغذ [illegible] بھیجے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے، وہاں سے کلکتے کو

بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکمِ منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی، اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔ بلکہ اسی نیاز نامے میں کچھ حسنِ طلب بھی تھا۔ افسوس کہ ایسا خطِ ضروری نہ پہنچے!

دوسرا خط جنابِ عالیۂ مغفورہ کی تعزیت میں تھا۔ اُس کا بھی ذکر اس عنایت نامے میں نہ تھا۔ ناچار پہلے خط کا مضمون اس ورق میں مکرر لکھ دیا، اور دوسرے خط کے صرف ذکر پر اکتفا کیا۔ حق تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، اور صبر و ثبات و دولت و اقبال و عمر و جاہ و جلال! ربِّ دوام عنایت کرے!

دو غزلیں منجملہ بارہ غزلوں کے بعدِ اصلاح ارسال کرچکا ہوں۔ خدا کرے، پہنچ گئی ہوں! پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحب و قبلہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا۔ از راہِ احتیاط وہ قطعہ اس ورق میں پھر لکھتا ہوں، اور نیز از راہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ کرتا ہوں۔

زیادہ حدِ ادب۔ عریضۂ اسد اللہ خاں، معروضۂ دوشنبہ چہاردہم رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ہژدہم اپریل سنہ ۱۸۵۹ء

قطعہ

جنابِ عالیہ از بخششِ حق	بفردوسِ بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالبؔ سالِ رحلت	"خلود خلد" گفت از روی الہام

(۱۲۷۵ھ)

(۱۴)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

نوازشنامے کے ورودِ مسعود کی اطلاع دیتا ہوں، اور ہنڈوی کے پہنچنے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ کے مہینے کے سو روپیے پہنچے۔ خاطرِ اقدس جمع رہے۔

عزمِ ولایت کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو ہر جگہ مظفر و منصور و کامیاب رکھے! خدمت گزار ہوں، اور دعا و ثنا میرا کام ہے۔ بڑھاپے نے کھو دیا۔ جز نفسے چند مجھ میں کچھ باقی نہیں۔ زیادہ حدِ ادب۔

عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء

(۱۵)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم تسلیم گزارش کرتا ہوں۔ پرسوں ایک نیاز نامہ بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا اور اُس کا جواب جلد عنایت ہوگا۔ کل نوازش نامہ جس میں سو روپیے کی ہنڈوی بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء تھی، شرف درود لایا۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس جمع رہے۔

(شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء)

(۱۶)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجا لانے آدابِ نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا دردِ دل ہے۔ نامۂ ... میں اس کا اندراج مناسب نہیں جانتا۔ میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاستِ دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائی مروارید، خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں۔ اب یہ نوابِ معلّی القاب آئے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدر دان، جناب اڈمنسٹن صاحب، وہ بھی چیف سکرتر رہے، لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔ اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بے گناہ ہوں

یا گناہگار، مقبول ہوں، یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو ستحق انعام کا مستحق ہوں؛ لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستور قدیم کو برہم مارے[1]۔ بہرحال اس تشویش میں ہوں۔ راہ چارہ مسدود، اور دکھ موجود۔ عرفی[2] خوب کہتا ہے ؎

مراز مانۂ طنّاز دست بستہ و تیغ زند بفرقم و گوید کہ ہان، سرے میخار

فقط۔ مرقومۂ صبح یکشنبہ، نومبر سنہ ۱۸۵۹ء[3]

(۱۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجالانے آداب نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ منشورِ تہنیت جو نواب عالی جناب کی ملازمت کا حال بسبیلِ اجمال مندرج تھا، میں اندری اخبار بتفصیل دریافت کر چکا ہوں۔ ہندوستان میں کسی رئیس کے واسطے یہ بات کاہے کو ہوئی ہے! مسند تکیہ کسی کو کب ملا ہے! یہ کمال عزت و شان اور استحکام بنائے ریاست کا نشان ہے۔ لطف یہ ہے کہ اب صاحبانِ کورٹ آف ڈرکٹر[3] حائل نہیں رہے۔ گورنر جنرل بہادر نائب سلطنت ہیں۔ اس صورت میں جو کچھ انھوں نے دیا ہے، وہ عطیہ حضرتِ فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا ہے۔ ایسے شاہنشاہ کی سرکار سے وسادۂ سروری کا عطا ہونا، بہت بڑی نوازش اور سزاوارِ صدگونہ نازش ہے۔ یہ چار بالشِ امارت اور کاشی پور کا ضمیمۂ ملکِ موروثی ہونا، پہلے آپ کو، پھر ولیعہد بہادر[5] کو اور پھر آپ کے اولاد و اخوان و انصار کو اور سب ... بعد غالب دعاگوی گوشہ نشین کو مبارک ہو! زیادہ حدِ ادب

مرقومۂ صبح یکشنبہ، ۲۷ نومبر ۱۸۵۹ء[6]

(۱۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب نیاز بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ سو روپیے کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں[۱] تو کس سے کہوں؟ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو[۱] سو روپیہ[۲] اگر مجھ کو اور بھیج دیجیے گا، تو چلا لیجیے گا؛ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشت غالب۔ معروضۂ صبح پنجشنبہ ہشتم دسمبر سنہ ۱۸۵۹ بحجردِ ورودِ عنایت نامہ مرقومہ ماہِ حال[۳]۔

(۱۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب نیاز بجا لاتا ہوں، اور مزاج اقدس کی خبر پوچھتا ہوں، اور بکمالِ ناچاری، بصد گونہ شرمساری، عرض کرتا ہوں کہ آج سہ شنبہ ۷ فروری کی ہے۔ جو لوگ کہ میرے ساتھ ہیں، گوش بر آواز ہیں؛ اور جو وظیفہ خوار دلی میں ہیں، وہ چشم براہ ہوں گے۔ زیادہ حدِ ادب؟

خوشنودی کا طالب، غالب

صبح سہ شنبہ ۷ فروری سنہ ۱۸۶۰

(۲۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تقدیم مراسمِ تسلیم مقدمہ اس گزارش کا ہے کہ عالم دو ہیں: ایک عالمِ شہادت، ایک عالمِ غیب۔ جس طرح عالمِ شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالمِ غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ کہ وہ نقشہ پنسدار وں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اب صدر سے بعدِ صدورِ حکم آ گیا۔ حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہے۔ سو روپیہ مہینے والے کو چھتر بھی ہیں اور پچیس[؟] بھی ہیں، اور دس بھی ہیں

اب فرمائیے، میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاس کلی ہے، لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورمنٹ کا حکمِ منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے عملے میں اور وکلا اور اہلِ شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہو جائیں گے، اور جو معلوم ہوگا، وہ عرض کیا جائے گا۔[1] غالب۔ ۲۲ اپریل ۱۸۶۰[2]

(۲۱)

حضور،

سنہ ۱۸۵۸ء میں، یہ قصیدہ کہ گویا نامہ معلوم ہے، میں نے حضور میں بھیجا تھا اور بریلی کا[3] ملک ملنے کی تہنیت دی تھی۔ بعد اس کے حضرت کو دامنۂ کوہ کی محال، یعنی کاشی پور ملا۔ گویا یہ میری تحریر غلط ہو گئی۔ الحمدللہ انجامِ کار جو میں نے قصیدے میں قصد کیا تھا، وہی ہوا۔ اب ارشاد ہو کہ میں لسان الغیب ہوں یا نہیں؟[4] فقط

چون غیبت مرا شربتِ آبی نہ تو حاصل — دانم کہ تو دریائی [illegible] ساحل
در بادیہ بر گورِ غریبان، ز چہ سوزد؟ — آن شمع فروزان کہ بود [illegible] رِ محفل
زان خسروِ خوبان چہ قدر چشمِ وفا بود؟ — صد حیف، کہ شد نقشِ [illegible] ہمہ باطل!
افسانۂ غم گر نبرایم، نبود عیب — با دوست کہ پیوستہ [illegible] دو غم از دل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ "تن زن — چون می ندہد داد، ز فریاد چہ حاصل؟"
از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار — دل گفت کہ "ہان شیوۂ عشاق فروہل"
تا کس نبرد ظن کہ بشاہد بودم روی — حاشا، کہ حکایت کنم از لیلی و محمل!
شاہد بود آن دوست، کہ اندر غزل اورا — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل

من نالم ازان دوست که در عالم انصاف / شایان بودش گویم اگر خسرو عادل
او خسرو خوبان بود و بنده گدایش / او قلزم و عمان بود و من خس ساحل
گر خواجه همانست و گر دوست همانست / مائیم و یقینی که بوحدت شده کامل
خود هرچه بسر دوم همه با اوست کزین پیش / امید گهم بود بهر وادی و منزل
یارب چه شد اینک که نگیرد خبر از من / بربسته برویم در ارسال رسائل
ای یوسف ثانی [illegible] در همه عالم / مشتاق جمال تو چه دیوانه چه عاقل
گر نام تو در بحر نگنجید زیان نیست / شد نام نظیر تو و همنام تو داخل
تا نزد تو چون آیم و دور از تو چه سازم / ماندن ز تو دشوار و رسیدن بتو مشکل
ای کاش بکوی تو چنین روی نمودی / زینسان که فرو رفته مرا پای درین گل!
چونست که گاهی نکنی روی بدین سوی / از حیث که هرگز ندهی داد بسائل!
گر جان دهم از غصه تو دانی که به گیتی / حرفی غلط از صفحهٔ هستی شده زائل
خواهی که مرا بنگری از دور بفرمای / تا نزد تو آرند یکی طائر بسمل
از صنعت استاد ازل دان که ز هر سوی / چون قبله نما سوی تو ام ساخته مائل
غالب بسخن نام من آمد ازل آوره / دانی که درین شیوه نیم عامی و جاهل
در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب / این آیه خاصست که بر من شده نازل
من گنجم و گردون به گل اندوده درم را / می بین در گنج ارچه کشودن شده مشکل
خود در خور ویرانه بود گنج گرانمند / غم نیست گر آبادی دهلی شده زائل
هاروت فسون نفس گرم چه داند؟ / اعجاز ز دهلی بود و سحر ز بابل
آن را که صریر قلمم هوش رباید / دیگر نبرد ذوق ز آواز عنادل
توقع بریلی بتو فرخنده! که من نیز / بستم بفره مندی خویش از کرمت دل
حاشا که ستانم رقم فتاحی و مفتی! / حاشا که پذیرم عمل شحنه و عامل
بفرست خردمند کسان را بچکوست / در جیب گدا ریز قلیلی ز مداخل
هر سال ازان شهر بمن دایه روان ام / کز بهر همین گشته در انقطاع تو شامل

اُمید کہ لب تشنگیِ من نہ پسندی — زان رشحہ کہ برصفحہ فشانی ز انامل
اُمید کہ بپذیری و برمن نکنی قہر — بپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
اُمید کہ آن شیوہ نورزی کہ نگویم — کز دردِ دلم فارغ و از من شدہ غافل
ای رای تو در روشنی از مہر فزون تر! — ای روی تو در حسن دو چند از مہِ کامل!
تا مہر بیک سال کند دائرہ را دور — تا ماہ بیک ماہ کند قطعِ منازل
باشی بسپہرِ شرف آن ماہ کہ باشد — در نور بہ خورشیدِ جہانتاب مقابل

(۲۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

شکرِ بندہ پروری بجا لاکر عرض کرتا ہوں کہ کل ۱۲ جولائی کو نوازشنامہ مع ساڑھے سو روپیہ کی ہنڈوی کے پہنچا، اور روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ متوقع ہوں کہ یہ عطیہ چوتھی پانچویں انگریزی کو جیسا کہ ہمیشہ پہنچتا تھا، پہنچا کرے۔ دسویں بارھویں نہ ہوا کرے۔ تم سلامت رہو قیامت تک

خوشنودی کا طالب، غالب

صبح جمعہ ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۶

مطابق ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۶۰

(۲۴)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامے کے ورود سے میں نے عزت پائی۔ سو روپے کی ہنڈوی بابت مصارفِ مارچ سنہ ۱۸۶۱ کے پہنچی۔ زرِ مندرجہ معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس قرینِ جمعیت رہے۔ کلیاتِ فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجھ کو بہت خوشی حاصل ہوئی ہے۔ تم سلامت رہو قیامت تک! عنایت کا طالب، غالب

صبح یکشنبہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء

(۲۴)

ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم تورے اور خلعت کے عطیّے کا آداب بجالاتا ہوں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، اور اپنی اولاد کی اولاد کی شادیاں کرنی اور اُن شادیوں میں تورے اور خلعت کی تقسیم نصیب ہو۔

یہ تحریر نہیں، مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کرواکے اور آپ سے اجازت لے کے بطریقِ انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپیے، جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں؟

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

دادکا طالب غالب۔ دوشنبہ بحسابِ تعزیہ داراں پانچویں، اور از روی دوج ۶ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸

(۲۵)

ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آٹھ سات برس سے مصدرِ خدمت اور شریکِ دولت ہوں۔ لازم کرلیا ہے کہ بیہودہ گزارش نہ کروں اور کبھی کسی کی سپارش نہ کروں۔ بھائی حسن علی خاں کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا، اس کو میں سپارش نہ سمجھا تھا۔ مخبر بنا، اور آپ کے اہل کاروں کو اس بات کی خبر دی کہ جس کا تدارک صاحبانِ ملک دعا کمانِ عہد پر لازم ہے سو بمقتضای نصفت و عدالت وہ مقدمہ فیصل ہوگیا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو، واللہ باللہ، اگر میں نے بھیجا ہو! نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ، اور میرن مرثیہ خواں اور یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ

ہوا ایسے ہیں اور ایسے ہیں، غرض اس سے یہ تھی کہ محرم ہیں جہاں دس پانچ مرثیہ خواں اور مقرر ہوتے ہیں، میرن بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بجا تھانہ دار، کوتوال، تحصیلدار نوکر ہیں۔ میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں۔ کسی علاقے پر یہ بھی مقرر ہو جائیں۔ یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا، بہتر تھا، نہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف مُعَرِّف ہوتا تھا۔ سپارش کرنا، تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا؟ میری طرف سے خاطر عاطر جمع رہے۔

زسینہ تا بلبم سالہا شبیا بدراہ ہر آن نفس کہ رضای تو اندر آن نبود!

داد کا طالب، غالب۔ دوشنبہ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۱

(۲۹)

ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں، اور طلوعِ ستارۂ اقبال کی مبارکباد دیتا ہوں۔ یقین ہے کہ اس سفرِ فیض اثر میں "ریل گاڑی" کی سواری کی بھی سیر دیکھ لی ہوگی۔ یہ اُس میمنت و شکوہ و شوکت سے علاوہ ایک تماشا نیا دیکھا۔ حق تعالیٰ حضرت کو سلامت باکرامت رکھے!

دعا گو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے۔ ابتدا ہی قولنج دوری[2]۔ بسببِ استعمالِ ادویۂ حارّہ کہ اس مرض میں اُس سے گریز نہیں، تپ نے آ گھیرا۔ کئی بار [illegible] بھگتیں۔ اب دو بار یا [illegible] گئی ہیں؛ لیکن طاقت بالکل[3] سلب ہو گئی ہے، اور ضعفِ دماغ نے قریبِ ہلاکت پہنچا دیا ہے۔ بالفعل آبِ سیب کا استعمال ہے۔

طریقۂ دعاگوئی و ثنا خوانی کی رعایت سے نوبت بسبیل تہنیت، کہ جس میں حصولِ عطیۂ سلطانی کی ہجری و عیسوی تاریخ ہے، بہرحال لکھ لی ہیں۔ کل ورودِ عنایت نامہ سے معزز ہو کر آج وہ اشعار نذر کرتا ہوں ؎

زیادہ حدِّ ادب ہے تم سلامت رہو قیامت تک! شفقت کا طالب، غالب

دوشنبہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱

(۲۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل ایک شعر ظہوری مغفور کا اور ایک شعر غالبِ مرحوم کا ایک ورق پر لکھ کر، صبح کو ڈاک میں بھجوا دیا۔ شام کو توقیعِ فیض ہرکارۂ ڈاک نے لا دیا۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ کی پرورش کی ہنڈوی پہنچی، اور سو روپیے وصول ہو گئے۔

فقیر کا شیوہ صدق و سداد کا ہے۔ چند روز سے تفقّد و التفاتِ قدیم میں، خدانخواستہ باشد، کچھ کمی پاتا ہوں۔ اگر غلط ہے میرا گمان، تو بشرفِ اطلاع مشرف فرمائیے[2]؛ اور اگر میرا دلِ دیوانہ سچ سمجھا ہے، تو متوقع ہوں کہ عتاب کے سبب سے آگہی پاؤں[3]۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ صبحِ دوشنبہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ء [مہر: غالب ۱۲۷۸]

یہ عرضداشت جُدا ہے، البتہ اس کے جواب کا امیدوار ہوں[4] اور رسیدِ معمولی جُدا ہے[5]۔

(۲۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع روپیے کی ہنڈوی کے پہنچا۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ کے مہینے کی پرورش کا روپیہ وصول ہوا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

[مہر: غالب ۱۲۷۸] دوشنبہ ۱۵ ستمبر

(۲۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامے اور خط کی بھیجتا ہوں[۱] ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

حضور کی خوشنودی کا طالب، غالب

صبح سہ شنبہ ۴ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۴ء

(۳۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے معروض ہے۔ نوازشنامہ اور اس کے ساتھ دو بہنگیاں دو سو آموں کی پہنچیں[۲] ؎ شکر نعمتہای تو چندانکہ نعمتہای تو! زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

سہ شنبہ پنجم جولائی سنہ ۶۴

(۳۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت مع قطعۂ ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ (ماہ) بابت تنخواہِ جولائی سنہ ۱۸۶۴ کی معرضِ وصول میں آیا فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۴

(۳۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے، نوازشنامہ مع ہنڈوی عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ (بابت) بابتِ تنخواہِ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

ــــــہ

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ نہم ستمبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ صدورِ والانامہ سے میں نے عزت پائی۔ بذریعہ ہنڈی سو روپیے بابتِ تنخواہِ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ وصول ہوئے۔ زیادہ حدِّ ادب۔

ترحم کا مستحق اور تعقد کا طالب، غالب

دوشنبہ دہم اکتوبر ۱۸۶۴ عیسوی

(۳۶)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم و نیاز معروض ہے۔ جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبرِ وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا، اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں۔ اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

تمہاری سلامتی کا طالب، غالب

۸ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ابتدائی یکم نومبر سے ۱۱ تک، عرض نہیں کر سکتا کہ لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دُور، میں رنجور، معہذا بمقدور۔ اگر دلّی سے رامپور تک شکرم کی ڈاک جاتی ہوتی، تو میں یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا[۱] اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار ۸ ماہِ حال، یعنی نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت کی ہدایت نے اُس خط کے[۲] جواب آنے کی مدّت سے پہلے مجھے گردابِ اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نوازش نامہ آ گیا۔ گویا میری جان بچ گئی، بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آ گئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حالِ ناسازیٔ مزاجِ اقدس مفصل معلوم ہو۔ زیادہ حدِّ ادب۔[۳]

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عافیت کا طالب، [مہر: غالب ۱۲۷۸]

یکشنبہ ۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابتِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عافیت کا طالب، غالب

۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۹)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانبِ در نگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازشنامہ لائے بارے، خدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نو میری زندگانی ہوئی کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامۂ عالی دیا، جس کو پڑھ کر روحِ تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی، سونا کس کا! روشنی کے سامنے بیٹھا اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شعر مع مادۂ حصولِ صحت جب لکھ لیے، تب سویا۔ اب اس وقت وہ مسودہ صاف کر کے ارسال کرتا ہوں

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر و عافیت کا طالب، غالب

۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۴۰)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ عزّ ورود لایا۔ از روی ہنڈوی سو روپیہ بابتِ تنخواہِ ماہِ نومبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

تمھاری سلامتی کا طالب، غالب

۱۴ رجب و دسمبر سنہ ۱۸۶۴

(۴۱)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! چوب چینی کے

ارسال کا حکم ڈاک سے میں نے نہیں پایا۔ ۲۲ دسمبر کو ہرکارہ آیا۔ نوازش نامہ شرف افزا لایا۔ دِلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے رؤسا۔ بہرحال تین چار دن میں ہر ایک جگہ سے منگوا کر، رنگین و سنگین دے گرہ یا کم گرہ خود چُن کر، پانچ سیر قطعاتِ چوب چینی ایک ٹھلیا میں رکھ کر، آٹے سے منھ بند کیا، پھر کپڑا لپیٹا، ڈوری سے خوب مضبوط باندھ کر، دو جگہ اپنی مہر کی اور وہ ٹھلیا کہار کو سونپی ۵

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

روزِ دوشنبہ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴، وقتِ صبح حوالۂ کہارِ سرکار۔ [مہر: غالب ۱۲۷۸]

(۴۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامے کے ورود سے عزت اور ادراکِ صحت و عافیتِ مزاجِ اقدس سے مسرت حاصل ہوئی۔ پرچۂ ہنڈی اُس توقیع میں ملفوف پایا۔ سو روپیہ بابتِ تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

حضور کی سلامتی کا طالب، غالب

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۵ عیسوی

(۴۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ کرامت ظہور کے ورودِ مسعود نے میری عزت بڑھائی، اور اُس میں تنخواہِ فروری سنہ ۱۸۶۵ کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ سو روپیہ[ماعصہ] حضرت کا تصدق پایا

آلہی، وہ دن جلد ہو کہ جو میں سُنوں کہ حضرت نے غسلِ صحت فرمایا!
تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب
۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

(۴۴)

بحضرتِ فلک رفعت، نوابِ معلّی القاب، انجم گروہ، آفتاب شکوہ، بہ بخشش و بخشائشِ بینوایان را توانگر کن و ناتوان را توانا ساز، در عزّ و جاہ با تاجداران ہمسر و در ملک و سپاہ با شہریاران انباز، کہ بفرزانگی حلقہ در گوش افگنندۂ دانش گستران، و بمردانگی غاشیہ بر دوش نہندۂ دلاوران ہرچہ از نیایش و ستایش بتقدیم ہمی رسد، حرز بازوی ہمّت است[۱] نابدان نیرو در سخن دلیری تواند کرد۔

ہمانا از راز سپہر و ستارہ سخن ہمی رود[۲] و خجستگی و فرخندگی[۳] چند گفتہ می شود این نافِ ہفتہ کہ راستان در باستان این را "بہرام روز" میگفتند و اکنون "سہ شنبہ" نام دارد، روز بیست فیرور، دیژہ درین سالِ فرخ فال کہ دو یمین روز است از فروردین، در روز بیست[۲] و یکم از مارچ، و روز بیست و دوم از شوال۔ باری، نخست بر آن سرورِ شاہ نشان کہ امروز شستن اندام آبرو ی گرما بہ افزود، مبارک، و سپس بر غالبِ سخندان کہ عافیت جوی و دعاگوی این درگاہ ستنی، ہمایون!

ہمانا درین روزگار، خسرو ستارگان کہ مہر منیرش دانی، در برّہ، و از سوی فرازنختین سیارگان کہ زحلش خوانی، در ترازو، سعدِ اکبر بہ قوس و سعدِ اصغر بہ ثور، آن و نیّر بہ بیت الشرف خوشنود و شاد، و این دو اختر یکاشانہ ہای خویشتن آباد۔ گمان ندارم کہ از خسروانِ پارس و سلاطینِ عرب

ہیچ کس را چنین طالعی بہرِ جلوس اتفاق افتادہ باشد، کہ حضرتِ ولیِ نعمت را برای غسلِ صحت دست بہم دادہ است۔ خرد تا گفتارِ مرا شنود، چشمک زد و بہ بیچارہ سرود کہ "ای در درخشانیِ انجم آفتاب، چون کودکان در بالِ افشانیِ کرمکہای شب تاب، نگران! از حلقۂ اختر شماران بدر آی، و بہ دبستانِ حکمای روحانی رمزی از حکمتِ ایمانی بشنو، تا بدانی کہ بدین امیرِ مسند سریر، سلطان نظیر، عمرِ جاودانی و دوامِ لذتہای روحانی بخشیدہ اند۔" گفتم: "تا برہان نباشد" کالبدِ سخن را جان نباشد۔ مرا بے خیر مپندار، و اگر حجتی داری، بیار۔" گفت: "برہانی ازین ارجمند تر و حجتی ازین خرد پسند تر چہ خواہد بود کہ چون آفریدگان را در آن جہان عمرِ دوبارہ دہند، دیگر بیمِ مرگ برخیزد، و بہ بانگِ صور از خوابِ فنا جستگان در آن گیتی جاوید پایند۔ مگر صحتِ خداوند ازین رنجوری ہولناک" بدان ماند کہ پنداری عمرِ دوبارہ یافت؟ پس اقتضای دوبارہ زیستن تغیر چرا پذیرد؟ و چون ہستی یافتگانِ آن جہان در آن جہان جاودان زندہ مانند، آنکہ درین گیتی حیاتِ ثانی پذیرفتہ باشد، ہم درین گیتی ہمیشہ زندگانی چون نکند؟ این عمرِ عزیز کہ بخدایگان دادہ اند، عمرِ خضر و الیاس نباشد، کہ یکی را بشمردنِ ریگِ صحرا، و دیگری را بہ پیمودنِ آبِ دریا گزرد۔ ان‌شاءاللہ العظیم، جنابِ عالی، تا جہانست، پرویز بزم، تہمتن رزم، دشمن گداز، دوست نواز، بلبلِ درسخن اختر فشان، دکفِ درکرم گوہر فشان خواہند زیست۔

قطعۂ تاریخ غسلِ صحت، و قصیدۂ تہنیت کہ پیش ازین فرستادہ ام، نظمی است شاعرانہ، و این نگارش نثریست عارفانہ، قانونِ حکمت و شریعت را جامع، ہم از روی نقلِ حق، و ہم از روی عقل راست۔ بقای خداوند بعمرِ تازہ جاودانی، و نشاطِ بی اندازہ پیشکارِ این حیاتِ

ثانی باد! چارشنبہ ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ ھ و ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ -
(مہر غالب ۱۲۷۸)



"بحضورِ نواب صاحبِ والا مناقبِ عالی شان، قلزمِ فیض و عمانِ احسان، امیر المسلمین نواب کلبِ علی خاں بہادر دام اقبالہٗ مقبول باد"

[نواب سید محمد کلبِ علی خاں بہادر خلدِ آشیاں، نواب فردوس مکاں کے فرزند اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فیروز النسا بیگم صاحبہ، ملقب بہ نواب بہو بیگم، دخترِ سید عبد العلی خاں بہادر، خلفِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے بطن سے ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۹ اپریل سنہ ۱۸۳۵ء) کو اتوار کے دن صبح کے وقت متولد ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں گورنر جنرل کی منظوری سے ولیعہدِ ریاست اور ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن ۳۰ سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے۔ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۰ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو مسٹر جان انگلس، ایجنٹ ریاست و کمشنر روہیلکھنڈ نے رامپور آکر باضابطہ رسم مسند نشینی ادا کی۔ ماہِ رجب سنہ ۸۲ھ (دسمبر سنہ ۶۵ء) میں ملکۂ معظمہ کی جانب سے خلعت آیا، اور اسی مہینے میں جشنِ جلوس منایا گیا۔ آپ بڑے حاتم دل، پابندِ شرع، بامروت اور خلیق تھے۔ باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتے، اور غیر شرعی آمدنی سے خزانے کی دولت کو پاک رکھتے تھے۔ خود صاحبِ علم تھے، فارسی خلیفہ غیاث الدین عزت، صاحبِ غیاث اللغات، سے حاصل کی، اور علومِ حکمیہ مولوی فضلِ حق خیر آبادی اور مولوی عبد الحق خیر آبادی سے پڑھے۔ ان کا دربار اہلِ کمال سے بھرا رہتا تھا۔ مشرقی علوم و صنائع کا شاید ہی کوئی ایسا ماہر ہو جو ان کے خوانِ جود و کرم کی زلہ ربائی نہ کرتا ہو۔ ان میں علما، شعرا، ادبا، خطاط، صحاف، طباخ، اور دیگر تمام ہنروں کے ماہرین شامل تھے۔ علمی مباحثوں کا بہت شوق تھا۔ روزانہ دربار میں کسی نہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر اہلِ دربار طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ آپ خود برابر کا حصہ لیتے، اور اس طرح اپنے معلومات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بناتے

رہتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور اُنھیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اُس عہد میں جس قدر نایاب اور نادر کتابیں مہیا کی گئی ہیں، وہ اپنی اہمیت اور قیمت کے لحاظ سے مستقل کتاب خانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فارسی ادبیات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب کوئی نئی فارسی کتاب خرید فرماتے، اُس کے سرورق پر اپنے قلم سے تاریخِ آمد وغیرہ لکھتے۔ اُردو فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے، اور نوآب تخلص فرماتے تھے۔ فارسی کلام مرزا محمد تقی خاں سپہر، مؤلف ناسخ التواریخ، کی نظر سے گزرا تھا۔ اُردو کلام امیرِ مینائی لکھنوی دیکھا کرتے تھے۔ ایک فارسی نثر مرزا غالب کو بھی اصلاح کے واسطے بھیجی تھی، مرزا صاحب ان کی طرزِ نگارش کے بیحد مدّاح تھے۔ تصنیفات میں چار اُردو کے دیوان، دیوانِ فارسی، تاریخِ شاہانِ سلف، انتخابِ بوستانِ خیال اور متعدد نثریں ہیں۔ اخبار بینی کا بھی شوق تھا۔ دبدبۂ سکندری، رامپور کا پہلا اخبار ہے، اُنھیں کے ایما سے ۱۱ جمادی الآخرہ ۱۲۸۳ ہجری (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) سے ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا۔ آپ نے ۲۲ سال ۷ ماہ کی حکومت کے بعد ۵۳ سال ۲ ماہ ۷ روز کی عمر میں بدھ کے دن ۳ بجے کے وقت ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۳۰۴ھ (۲۳ مارچ سنہ ۱۸۸۷ء) کو انتقال کیا۔ امیر مینائی نے "خوابگاہِ حامیٔ اسلام امیر المؤمنین" سے تاریخ وفات نکالی ہے۔)

(۴۵/۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد آداب معروض باد۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی مبلغ ... عزِّ ورود لایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا روپیہ معہ منی [illegible] وصول ہوا۔ زیادہ حدِّ ادب۔ اسد

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
عنایت کا طالب، غالب
۶ مئی سنہ ۱۸۶۵ عیسوی[1]

(رباعی)

سرتاسرِ دہر عشرتستانِ تو باد! صد رنگ گُلِ طرب بداماںِ تو باد!
عید است و بہار خرمی ہا دارد جانِ من و صد چومن، بقربانِ تو باد![1]
عنایت کا طالب غالب شنبہ صبح روزِ عیدِ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۱ ہجری نبوی[2]

(۴۶/۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے تہنیت نامہ ارسال کرچکا ہوں، جواب پاچکا ہوں۔ قصیدے کا لفافہ ارسال کیا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔[3]
حضرت فردوس مکانِ سپہر آستاں کا معمول تھا کہ محرم سے دو تین مہینے پہلے سلام پانچ سات لکھتے تھے، اور فرداً فرداً میرے پاس بھیجا کرتے تھے۔ جب وہ فراہم ہو چکتے، تو محرم سے دو چار دن پہلے میں اصلاح دیکر بھیج دیا کرتا تھا۔ اب کے برس ایک ہی سلام بھیجنے پائے بس۔ آج وہ سلام اِس مراد سے حضور میں بھیجتا ہوں کہ حضور کے حکم سے حضرت کے دیوان میں شامل ہو جائے۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں![5]
عنایت کا طالب، غالب
شنبہ یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲[6]

(۴۷/۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حق تعالیٰ، جَلَّ جَلالُہٗ وَعَمَّ نَوالُہٗ جس گروہ پر

مہربان ہوتا ہے، وہاں حاکم عادل رحیم بھیجتا ہے، کہ وہ بقوّتِ عادلہ کفر و بدعت کی جڑ اکھاڑ ڈالے[۱]، اور بصفتِ رحم رعایا کو پالے۔ مصداق اس کا ذاتِ قدسی صفاتِ جنابِ عالی ہے، کہ قمار خانے کی بنا مِٹا ڈالی ہے۔ زہے قانونِ سیاست! غلّے کا محصول معاف کر دیا ہے، روپیہ رعیّت پر نثار کیا ہے۔ زہے آئینِ ریاست![۲] ؎

رباعی

نوّاب کہ شد زشوکتِ اقبالش بخشیدنِ باجِ غلّہ از افبالش[۳]
فارغ شد ہر کسی و ردداد فراغ ہم "فارغ" و ہم "فراغ" باشد سالش[۴]

پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اُس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، ۱۰۰ کی ہنڈوی اُس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی۔ دو قصیدے[۵] مدحیہ میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم، اور وہ دیوان حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ خطوں کی تصدیق از روی دفتر ہو سکتی ہے یہ رسم بُری نہیں ہے۔ اگر جاری رہے، تو بہتر ہے۔ زیادہ حدِّ ادب۔

التفات کا طالب، غالب۔ پنجشنبہ ۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۱

(۴۸/۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نامہ مع سَو روپیے کی ہنڈوی کے عزِّ ورود لایا۔ مئی سنہ ۱۸۶۵ کا مشاہرہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

التفات کا طالب، غالب

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۵ عیسوی[۶]

(۴۹/۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ روزِ پنجشنبہ ۱۵ جون کو ایک عرضداشت روانہ کر چکا ہوں۔ یقین ہے کہ وہ آج پہنچے گی۔ کل ۱۷ جون کو فرح بخش و روح افزا نوازشنامہ پہنچا! قصیدے کا پہنچنا اور اُس کا مقبول و منظور ہونا دریافت کرکے اپنی بخت و قسمت پر میں نازاں ہوا! اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوانِ فارسی میں، جو کتاب خانے میں موجود ہے، درج کیا جائے اور سلام حضرت فردوس مکاں کا اُن کے دیوان اُردو میں لکھدیا جائے۔

حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرام بیت المعمور رامپور باندھا، اِنْشَاءَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم۔

پیر و مرشد، ازراہِ خیرخواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں رئیس ٹونک، نے بعدِ مسند نشینی گورمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو جزو "ملک و جنگ" لکھ کر دیے، اور وہاں سے وہ اُن کو عطا ہوے۔ حضور کے اجدادِ امجاد نے سلاطینِ بابریہ کا خطاب نہ قبول کیا۔ مگر حضرت کے جدِّ امجد کو احمد شاہِ دُرّانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔ حضرت اگر مناسب جانیں، تو اُس خطاب کو مع دو جزو "شمس الملک و بہرام جنگ" جنابِ ملکۂ معظمہ سے بذریعۂ گورمنٹ اپنے واسطے لیں؟ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

نیاز نامہ دولت کا طالب، غالب۔ یکشنبہ ۱۸ جون سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۰/۶)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے منشورِ عطوفت کے ورود نے معزز فرمایا۔ جون سنہ ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا سو روپیہ اندر وی ہنڈوی معرفتِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب سے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عنایت کا طالب، غالب

معروضۂ دہم جولائی سنہ ۱۸۶۵

(۵۱/۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ میری عرضداشت کا جواب آ چکا ہے، بلکہ ہنڈوی کی رسید بھجوا چکا ہے۔ یہاں خلق کو مینہ درکار ہے، اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تنور، اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز، ہوا جانستاں، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جزا عضای انسان کے، کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ باؤ چلتی ہے۔ بامطلق ہوا نہیں ان سطور کی تحریر سے مدعا یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ حضرت کا مزاج کیسا ہے۔ اِس خط کا جواب جس قدر جلد عطا ہوگا، دعاگو پر احسان آپ کا ہوگا۔ زیادہ حدِ ادب سے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپ کی سلامتِ ذات اور اپنی نجات کا طالب، غالب

۲۳ جولائی سنہ ۱۸۶۵

(۵۲/۸)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض آں کہ منشورِ عطوفت عزِ ورود لایا۔ تنخواہِ جولائی سنہ ۱۸۶۵ حال کا ماعہ روپیہ از روی ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ فقط اگرچہ یہاں مینھ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں، بنظرِ اصلاحِ نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۱۱ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵

۱ مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس

۲ کہاں ہے ساقیٔ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بیار لامیٔ گلنار گوں، ببار، برس

۳ خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس

۴ ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
"امیر کلبِ علی خاں جییں ہزار برس"

۵ فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس

۶ جنابِ قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس!

(۵۳/۹)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاجِ اقدس ناسازہ ہو گیا تھا، اب خدا کے فضل و کرم سے افاقت ہے۔ نواب مرزا نے مجھ پر ستم کیا، کہ پہلے سے یہ حال نہ رقم کیا۔ جو دعا جب کرتا، اب بھی وردِ شب و روز ہے۔ مگر یہ خیال کہ حضور کو خیال گزرے گا کہ غالب رسمِ عیادت بجا نہ لایا، سخت جگر سوز ہے۔ اب اس خط کے جواب میں نویدِ عافیت کا امیدوار، اور یہ سوچ کر، کہ آج کے آٹھویں دن جواب آئے گا، بیقرار ہوں۔

ایک عبارت کا ایک جزو بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اُس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا عزّ و شرف جانیں گے؟۔ ~

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

دعا گو، غالب۔ ۱۴ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵

(۵۴/۱۰)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ داستانِ حمزہ قصّۂ موضوعی ہے۔ شاہِ عباس ثانی[۳] کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اِس کو تالیف کیا ہے۔ ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان اِس کو کہتے ہیں، اور ایران میں رموزِ

حمزہ“ اس کا نام ہے۔ دو سو کئی برس اس کی تالیف کو ہوئے۔ اب تک مشہور ہے، اور ہمیشہ مشہور رہے گا۔

آپ کے اس نکبہ دار، روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے مشتمل اس التزام[1] پر کہ تشبیب کی[2] ابیات اور مدح کے اشعار میں حمزہ و اولادِ حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یا ان کے معاملات و حالات کا ذکر درمیان آئے۔ سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حضرت اِس کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔ خدا آپ کو قیامت تک سلامت رکھے! اگرچہ جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہے گا، یہ قصیدہ بھی شہرت پزیر رہے گا[2]؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔ ۱۲ ماہِ اگست ۱۸۶۵ء

یا وہاب!

زہی دو چشم تو در معرضِ سیہ کاری چو بختیارک و بختک، بہ ردم آزاری
زہی تر و ر بدیع الزمانِ کشتی گیر کہ کوہسار، چو نارنج تر بیفشاری
زہی خیالِ تو آدم ربا، چو شندک دیو دماغ اہلِ نظر قافِ اوست پنداری
زغمزۂ تو چگویم؟ کہ آن بود ز عمر[3] دلیر و چُستی و ہُنر مند و بعیّاری
اگر تو نیستی از ساحرانِ اِنتریا چرا، بلہو، ہمی آتش از ہوا باری
بدین جمال کہ داری عجب مدار، اگر کند حکیدۂ قدرت ترا پرستاری
بمہر ردی تو گردیدم آفتاب پرست نہ ایرجم کہ عبث تن دہم بدین خواری
سپس بمذہبِ تو رجح کہ بودہ ماہ پرست ترا پرستم ازین رو کہ ماہ رخساری
توئی بمعنیٔ اصلی دبود نورِ الدّہر ہمیں بنام کہ معنی نداشت، پنداری
چکد ز زلفِ تو خونِ دلم بدانگونہ کہ ریزد از لبِ زنگی در آدمی خواری
فغان ز بارِ حجم دہر، کان بسنجیدن عمودِ خسرو ہنداست در گرانباری

به پیشِ چرخِ مشعبد، چه هوشیار و چه مست؟
که این لعبدیده، همچون عمر، ز طرّاری

ز روی ریش تراشد همی به بیهوشی
ز فرقِ تاج رباید همی بهشیاری

خصومتی بمن افتاده زالِ دنیا را
که دُم خبیثه بود در فنونِ مکّاری

بجلیشِ عشق منم سر برهنهٔ تنبیشی
که موی سر بسرم کرده است دستاری

بهیبتِ فتنه به الچوبِ شمش گزی ماند
که بود هر لگدش را جراحتِ کاری

شدست لاغریٔ من گلیمِ غیبیٔ من
که باشم و توام از حاضران نه انگاری

منم که فکرِ من اندر زمینِ شعر و سخن ق
همین گذشت ز اشقر به تیز رفتاری

چه اوفتاده؟ که یارب، کنون چوار تائیس
بخاک و خون تپدم تن همی به ناچاری

چنان بخوردنِ غم عادیم که چون عادی
نبوده هیچگهی سیریم ز پُرخواری

نهاده همنفسان نامِ من ملک قاسم
ز خونِ دیده بود بسکه جامه گلناری

رسیده بخل بفکرِ من از عمر میراث ق
که هیچگه ندهد در سخن مرا یاری

دروغ گفته ام، آن فکر نیز بخیل است
که گم شود ز عمر در دمِ گرفتاری

چو حمزه را بجهان، بعدِ مرگِ مهرنگار
ز تیغ و تاج و نگین ردی داد بیزاری

نماند در نظرِ دزد و کهنه اسلوبی
جز آن که باز کشاید دکانِ عطّاری

دل است حمزه و لب در فسونگری عمر است
جدا کسی که ز دل نبودش مددگاری!

شد آن که بود کلامم طلسمِ گوهربار
همارهٔ نهر ز آبِ گهر دران جاری

چو حمزه، کشش بعقابین درکشید فلک
به دامِ دام، نفس میکشم بدشواری

تقاضت قرض و منم حمزه و ز بهرِ منند
چهل خلیفه، تقاضائیانِ بازاری

چو ساحرانِ همه را شغلِ آتش افشانی
چو اژدها، همه را ذوقِ آدم اوباری

ز زهرِ مهره نشد زهرِ حمزه به، آن به
که نوشداروی نوشیروان بچنگ آری

مگر بفضلِ وی آییم برون ز بندِ بلا
چنانکه حمزه، به نیروی پیرِ فرهاری

امیرِ کلبِ علیخان بهادر، آن که بود
عدیلِ حمزه در اسپهبدی و سالاری

درش نوازشِ طبلِ سکندری دارد
خهی بلندیٔ آوازهٔ جهانداری!

بود بپا رکِ افراسیابیش در کعت | کہ ہیچگہ نشود، چون ہلال، زنگاری
چگویمت از نمطِ لشکرِ ظفر پیکر | ق کہ در شمار نیاید ہمی ز بسیاری
ہمہ مقابلِ مُقبِل، بہ ناوک اندازی | ہمہ مساہم خسرو، بہ طاقت اتہاری
بیا، بہ بین کہ در ارددی این امیر کبیر | سپردہ اند علمنا ہ را علم داری
چو قندر، آن کہ جلو دارِ حمزہ بود اینک | رسیدہ است بخاقانِ چین، جلو داری
سزد کہ فخر بر اقبالِ خود کند قندر | ازین کہ یافتہ توقیع گرز برداری!
مپرس بر درش از ہستی زمردِ شاہ | مگر یکی بود از کافرانِ زنہاری
شنیدۂ کہ خداوندِ باختر چون بود؟ | کنون بہ بندگیٔ خواجہ گشت اقراری
گذشت آن کہ "چہ تقدیر کردہ ام" می گفت | بمقتضای غلط فہمی و غلط کاری
کنون بعجز "چہ تقصیر کردہ ام" گوید | ز بندگانِ خدا چون بوی رسد خواری
رموزِ حمزہ فرو ہل، خمش نشین غالب | چرا مرا سخنہای ہرزہ آزاری؟
زنست رونقِ گیتی بہ دانش آرائی | زنست زینتِ معنی بہ نغز گفتاری
قصیدۂ تو، ولی، کاسۂ گدائی تست | ستودہ آمدہ باشی ز رنجِ ناداری
غمین مباش کہ از گنج خانۂ نوّاب | خود آن قدر کہ بدل داشتی بدست آری
بوقتِ گدیہ گدا را دعاست دست آویز | برآر دست بدرگاہِ حضرتِ باری
چراغِ دودۂ سرور، علی محمد خان | گزین نہالِ ثمر در فنِ سپہداری
زرِ دی کلبِ علیخان ہمیشہ روشن بادا | چنانکہ تابشِ مہر از سپہرِ زنگاری

(۵۵/۱۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم عرض یہ ہے۔ فقیر تکیہ دار، روزینہ خوار، غالبِ خاکسار حیران ہے کہ شکر بجا لاوے آپ کی عنایت کا، یا ذکر کرے آپ کی کرامت اور ولایت کا۔ آپ بے شبہہ رونقِ مسندِ علم و یقین ہیں! تکلف برطرف، امیر المسلمین ہیں۔ یہ نہ فقط از روی ارادت ہے، بلکہ یہاں مشاہدۂ خرقِ عادت ہے

ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار اسرگرمِ تقاضا، بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپیے کی ہنڈوی صراحئ آبِ حیات ہوگئی، دامِ مرگ سے نجات ہوگئی۔ لطف یہ کہ آج بروزِ دوشنبہ ۲۱ اگست کو نو بجے اوّلِ روز ایک قصیدے کا لفافہ بھیجا گیا۔ اسی دن بارہ پر تین بجے یہ کرشمۂ کرامت دیکھا گیا۔ قصیدے کے لفافے میں ایک عرضداشت ہے۔ اس سے قصیدے کی حقیقت اور خود اس نظم سے طرزِ نگارش کی جدت ظاہر ہوجائے گی۔ حضرت کے انبساطِ خاطر کے واسطے یہ ایجاد ہے مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے آپ کی خوشی اور خوشنودی مراد ہے۔ انجامِ قصیدہ میں جو قرض کے گلے پائے جائیں اُس مجموع میں سے اہلِ بازار منہائی کئے جائیں، کوٹھی والے ساہوکار حیل خلیفہ گنے جائیں ۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترقئ عمر و دولتِ خداوند کا طالب، غالب

نگاشتۂ دوشنبہ ۲۱، اور رواں داشتۂ سہ شنبہ ۲۲ اگست سنہ ۱۸۶۵

(۵۶/۱۲)

حضرت ولئ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں۔ ستر برس کا آدمی ہوشیار ہوں۔ اور سے یہ کہا نہیں جاتا۔ حضرت پر بغیر ظاہر کئے رہا نہیں جاتا۔ خدا جانے، اور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا۔ میرے نزدیک باشتراکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظِ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی وجدوار کا استعمال ضرور ہے۔ اور معجونِ طلائی عنبری تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم ببر علی خاں مغفور ہے: ورقِ طلا، عنبر اشہب عرقِ کیوڑہ، قند، کثرتِ اجزا اس ترکیب خاص میں ناپسند۔ کثیر الاجزا اور

معجونیں ہیں: مفرح یاقوتی علی سینا، خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاؤزبان عنبری، ناشتہ
غیر مُتَشَتّی؛ جس میں طیور کے گوشت اور ادویۂ مفرح وغیرہ کی [illegible]
میں معتدلاً۔ گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجیے۔ غذا میں گوشتِ طیور، بکرے،
بیضۂ نیم برشت اکثر، لیکن یہ خیال رہے کہ بیضۂ مرغ و نیم ایک جلسے میں تناول
نہ فرمایئے۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور خوب۔ بید مشک
کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانے میں موجود رہے۔ عطریات
استعمال میں مبالغہ، بعدِ غذا مباشرت سے پرہیز۔ شوربا [illegible]
خاص پر موجود رہے۔ بحسب رغبتِ طبیعت نوشِ جان فرماتے رہیے۔ ع
تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

(۵۷/۱۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ شرف افزا ملفوفہ نامۂ عز ورود لایا۔ اگست
۱۸۶۵ کی تنخواہ کا سو روپیہ از روئے ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔
زیادہ حدِ ادب۔ ع

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب
دوشنبہ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۵

(۵۸/۱۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا
لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے
قدموں کی قسم! دل نے قبول نہ کیا۔ آرایشِ گفتار، نظماً و نثراً، واسطے تہنیت کے
ہے کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت راہ دیتی ہے

الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف جس بات کا تصور ناگوار ہو، اس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بیقرار ہو؟ یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ ہنوز تہنیت اور مدح کا حق ادا نہ ہوا تھا کہ مرثیہ لکھنا پڑا۔ اگر ایک بات میرے خیال میں نہ آئی ہوتی، تو مجھے زندگی دشوار تھی۔ یعنی حضور کو ابتدائی خلوص میں وہ رنج پہنچا کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا۔ پس وہ سادہ نشینی کی بدایت اور غمگینی کی نہایت یہ چاہتی ہے کہ اب مدۃ العمر، اَبَدًا مُؤَبَّدًا، حضرت کو کوئی غم نہ ہو۔ ہمیشہ جہاندار و جہانستان و شاد و شادماں رہیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آپ کے قدمبوس کا طالب، غالب۔ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۵

دریغا! کہ ماندہی نصر دولت زخاتونِ نامی، سکندر زمانی

چو ستیارِ "روضہ" بود سالِ فوتش سپس اسم دی یاد "جنت مکانی"![2]

۱۲۸۲

(۵۹/۱۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ہر چند آبدار خانے کے ساتھ ہونے سے پانی کی طرف سے خاطر جمع ہے، کہ حضور جو پانی ہمیشہ پیتے تھے، وہی پیتے ہوں گے، مگر ہرجِ سفر اور اختلافِ ہوا کا خیال ہے۔ توقع رکھتا ہوں کہ نویدِ صحت و اعتدالِ مزاجِ اقدس سے عزِ اطلاع پاؤں۔ بُعد اگرچہ بہت نہیں لیکن طبع پر گراں ہے۔ چشمِ شوق درودِ موکبِ عالی کی نگراں ہے۔ بقولِ اُستاد بہ تغیرِ لفظ ؎ جو تم پھر آؤ، تو حضرت، پھریں ہمارے دن[3]۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

دوامِ بقای حضور کا طالب فقیر غالب
چہار شنبہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۵[۱]

(۶۰/۱۶)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اتر آنے کے پل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب کا، یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اسی زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو ان پر گزری، وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا، بھوکا، پیاسا، کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے۔ اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور آئے، اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آکر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگرای دار السرور رامپور اور میں جادہ نوردِ ستم آبادِ دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ/ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء درِ غمکدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلی پہنچتا! ۸

مغلوبِ غلبۂ غمِ دل، غالبِ حزین
"کاندر تنش ز ضعف، توان گفت، جان نبود"

ازرامپور زندہ بہ دہلی رسیدہ است
"مارا بدین گیاہِ ضعیف این گمان نبود"

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۲۲ شعبان و ۱۰ جنوری سالِ جشنِ حضور

(۶۱/۱۴)

حضرتِ ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامۂ والا کے مشاہدے نے مجھ کو میری حیات پر یقین عنایت کیا۔ اس سفر کا حال کیا عرض کروں؟ دِلّی سے رامپور تک، ذوقِ قدمبوس میں جو آتا نہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا، اور رنجِ راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا، کہ جوہرِ روح گداز پاکر ہر بُنِ مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہ ہوتی، تو دِلّی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، مینہہ، قبض و انقباض، فقدانِ چوج، قافلہ ہائے متواتر، منزلہائے نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوائے زمہریر کا چانگزا رہنا، بارے ہاپوڑ سے چل کر نیّرِ اعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دِلّی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیرِ ناتواں ہوں، جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اس در پر پہنچوں! ۵۰

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۶

(۶۲/۱۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع مع سو روپیے کی ہنڈوی کے عزِّ ورود لایا۔ جنوری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا آپ کے غلامِ نو خرید اسنے اپنی تنخواہ کا حال پوچھا۔ میں نے حضور کا خط اُسے دکھا دیا۔ نا امیدانہ چُپ ہو رہا۔ اب اس درویشِ دلریش کا حال سُنیے۔ سامعہ مدت سے کھو بیٹھا[۱]۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا[۲]۔ دور سے صرف قد و قامت آدمی کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے[۳]۔ فقدانِ طاقت، سقوطِ اشتہا، ضعفِ بصر، ضعفِ بخت۔ میرا حال بعینہٖ میرے اس شعر کے موافق ہے ؎

درکشاکشِ ضعفم، نگسلد روان از تن   اینکہ من نمی میرم، ہم ز ناتوانیہاست

زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس!   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۶

(۶۳/۱۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع کے ورود نے میری آبرو بڑھائی اُس میں سے میں نے سو روپیے کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ فروری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ میں نے پایا۔

زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

معروضۂ ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۶   عنایت کا طالب، غالب

(۶۴ / ۲۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتوان تھا، اور اب نیم جان ہوں۔ برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدے کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو۔

حضور اس مطلع کے لفظ و معنی کی جدّت و جدّت کی داد چاہتا ہوں

ہم در قیام بندہ نیم کز برای خویش ... آن وقت ہای نافہ ام از دو پای خویش

ایک غزل نئی طرز کی، نئی بحر میں عرض کرتا ہوں۔ یہ جشنِ حال کی نذر ہے۔ خدا کرے، مقبول ہو! زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس ! ... ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۲۹ مارچ سنہ ۱۸۶۶

بحر ہزج مثمّن سالم

فعِلاتُن فعِلاتُن فعِلاتُن فعِلاتُن

ای خداوندِ خردمند و جہان داورِ دانا!

وی، بہ نیروی خرد، بہ ہمہ کردار توانا!

ای بہ رفتار و بہ دیدار، بہ زیبائی و خوبی!

سروِ نوخاستہ آسا، مہِ ناکاستہ مانا!

بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقدہ کشایا!

بہ کرم ابرِ عطایا، بہ غضب برق سنانا!

بہ نگہ خستہ نوازا، بہ سخن بذلہ طرازا!

بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا!

شہ نشان، کلبِ علیخان کہ توئی یوسفِ ثانی

نبود ثانی و ہمتای تو در دہر، ہمانا!
دانم کہ از حال و آلم خبری داشتہ باشی
سرنوشتِ ازلی، گرچہ ندارد خطِ خوانا!
دشمنم چرخ و ز بیتی و لنوزی بعتابش
بہ مدد صاعقہ ریزا، بہ محب فیض رسانا!
حافظینِ تو کنند نامِ ترا زندہ بگیتی
باد فردوس برین جای تو، فردوس مکانا!
غالب، از غم چہ خروشی؟ بتو زیباست خموشی
با کریم ہمہ دان ہیچ مگو، ہیچ مدانا!

(۶۵/۲۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور مع ہنڈوی عزِ ورود لایا سو روپیہ تنخواہِ اپریل سنہ ۱۸۶۶ کا سرجن وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔
تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب
۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

(۶۶/۲۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی، تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی، مقطع اُس کا یہ ہے:

غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا!
وہ دن گئے جو کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ حضرت کے پسند آئے! زیادہ حدِّ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشت اسد اللہ بیدستگاہ

۹ جون سنہ ۶۶

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قطعہ

در پر امیرِ کلبِ علیخاں کے ہوں مقیم
شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں اسد
خیرات خوارِ محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

(۶۷/۶۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ایک عرضداشت مع ایک غزل کے ڈاک میں بھیجی گئی۔ شام کو منشورِ عطوفت مع ہنڈوی تنخواہِ مئی سنہ ۱۸۶۶ء عزّ ورود لایا۔ سورو پیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آج صبحدم وقتِ تحریر اس عرضی کے حضرت فردوس مکاں کا دیوان پیشِ نظر تھا۔ اس میں یہ شعر نظر پڑا۔ اس کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ نے بڑا مزا دیا۔ یقین ہے کہ اس کو

پڑھ کر حضرت بھی حظ اُٹھائیں گے ۔

وہ جس طرح سے جسے چاہیے، اُس طرح پالے
کسی کا کچھ نہیں پروردگار پر اپنا

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عرضۂ اسد اللہ ترابی ذاہ
معروضۂ دہم جون سنہ ۱۸۶۶ء

(۶۸/۲۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت،

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیع وقیع عزّ ورود لایا، غزل کے پہنچنے نے میری سخنوری کا رُتبہ بڑھایا۔ کیوں نہ چاہتا کہ میرا کلام پسند طبائع اہلِ کمال ہو۔ حضرت کو خالقِ اکبر نے وہ قوت اور وہ قدرت عطا کی ہے کہ آپ علی الرغم فلک کام کر سکتے ہیں ۔

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

فلک نے مجھ پر بڑے بڑے ابواب غم و فکر کے ڈال دیے، پر میری طبیعت بدل نہ سکا۔ میں نے بجناب باری بیدادگری فلک کی شکایت کی، بہرحال قسمت بدل نہ سکا۔ زیادہ حدِ ادب ۔

تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عرضداشت اسد اللہ ہیچمدان ۲۸ جون ۱۸۶۶ء

[میرزا صاحب نے آغا احمد علی احمد صاحب مؤید برہان، کے جواب میں ایک قطعہ لکھ کر مطبع اکمل المطابع دہلی میں ایک ورق چھپوایا تھا، اور دس چھپی ہوئی کاپیاں نواب خلد آشیاں کو لفافے میں بند کرکے

۳۱ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء کو روانہ کی تھیں، جو آج تک دارالانشا میں محفوظ ہیں۔ مکاتیب کے پہلے ایڈیشن میں مستقل خط کی طرح اس قطعے کی نقل چھاپی گئی تھی۔ بعد ازاں اس منقول کو بیجا خیال کر کے نکال دیا گیا۔]

(۶۹/۲۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج شنبہ ۱۰ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کی ہے۔ فقیر چشم براہ تھا کہ ابھی ڈاک کا ہرکارہ آتا ہے، اور ہنڈوی ملفوفہ نوازشنامہ لاتا ہے۔ ناگاہ اس وقت ڈاک کا آدمی ایک خط برخوردار منشی سیلچند کا لایا۔ اس میں مندرج تھا کہ تو نے جون سنۂ حال کی تنخواہ کی رسید کیوں نہ بھیجی۔ اور بعد اس کے یہ لکھا تھا کہ جولائی کی تنخواہ کی چھٹیاں ہوتی جاتی ہیں۔ اب دو ایک دن میں تیری تنخواہ بھی بھیجی جائے گی۔ متحیر کہ یارب، میں حسبِ معمول تنخواہِ جون کی رسید ارسال کر چکا ہوں۔ اب دوبارہ رسید کیوں مانگی جاتی ہے؟ پھر یہ تو گویا پیامِ مرگ تھا کہ جولائی کی تنخواہ اب روانہ ہوگی۔ یارب! ۱۰ کو وعدہ، ۱۳، ۱۴ کو چلے گی، بیسویں تک مجھے پہنچے گی، اور میرا حال یہ کہ انگریزی تنخواہ گھر میں، اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے۔ حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزرا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔

خلاصہ دو عرضیں ہیں: ایک تو یہ کہ میں جون کی تنخواہ کی رسید بھیج چکا ہوں۔ اگر ڈاک میں تلف ہو گئی ہو، تو اور لکھ بھیجوں؟ دوسری یہ کہ اس مہینے کی یعنی جولائی کی، تو تنخواہ خیر۔ ۲ ماہِ اگست تک پہنچ جائے گی۔ آیندہ کو حکم ہو جائے کہ ہر مہینے کی پہلی دوسری کو فقیر کی تنخواہ کہ وہ محض صیغۂ خیرات ہے، بھیجی جایا کرے۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
نجات کا طالب، غالب فقط

(۷۰/۲۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ پہلے اپنا حال عرض کر لوں، تب کچھ اور بات لکھوں۔ غم نے کھوکھلی بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! نہ حواس درست، نہ رائے صحیح۔ برسوں سے مکر دہات میں مبتلا رہتے اب طاقت تحمّل کی نہ رہی۔ خدا جانے، کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں۔

کل آخرِ روز میر منشیٔ حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید کے نہ پہنچنے کی اطّلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اُسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیجدی۔ آج آخرِ روز توقیعِ رفیع مع جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختار کار کو دی، اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا۔ لکھ کر لفافہ کر رکھتا ہوں۔ کل صبحدم ڈاک میں بھیجدوں گا۔

اگر عرضیٔ سابق میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بدحواسی کی ہو، تو فقیر کی خطا معاف ہو۔ میر منشی صاحب کے اگر مخالفِ طبع کوئی لفظ ہو تو وہ بھی درگزر کریں۔

جون کی تنخواہ کی رسید کا لفافہ ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا۔ اگر میں بھی بھول گیا ہوں، تو بعید نہیں؛ بلکہ اغلب ہے کہ غالب کو سہو ہوا ہو۔ ملازمانِ درِ دولت پر ظاہر ہو کہ جون کی تنخواہ جولائی میں، اور جولائی کی اگست میں میں نے پائی۔ آیندہ ہر انگریزی مہینے کی دوسری تیسری کو روانگیٔ ہنڈوی کا متوقع ہوں۔ زیادہ حدِّ ادب!

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ عفو و رحم کا طالب، غالب

(۷۱/۲۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت مدظلہ العالی!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیع رفیع مع دیباچۂ شرح اشعارِ بدرِ چاچی[1] عزِّ ورود لایا۔ کیا عرض کروں کہ کیا عالم نظر آیا! واقعی افتتاحِ کلام بطرزِ میرزا طاہرِ وحید[2] اور پھر نگارشِ مطالب بشیوۂ میرزا جلالا ای طبا طبائی[3] ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجازِ خسروی[4] کا رنگ جلوہ گر ہے پس ناقدِ بصیر کے نزدیک یہ نگارش، طاہرِ وحید اور جلالا کی عبارت سے بہتر ہے۔ یہ عرضداشت جلد بھیجتا ہوں، تاکہ حضرت پر پہنچنا اس دیباچے بالتقریظ کا ظاہر ہو جائے۔

برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون[5] ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں، عرش آرامگاہ اکبر شاہ[6] کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی، یا امسال نظر آئی ہے۔ اوراقِ مرسلۂ حضور موم جامے میں لپیٹ کر بسبیلِ پارسل ارسال کروں گا، یا پرسوں دو شنبے کو، یا سہ شنبے کو ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

روزِ شنبہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ نجات کا طالب، غالب[6]

(۷۲/۲۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور عزِّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ معرفتِ وصول میں آیا۔

نثرِ نثرہ نثار کے اوراق ۳ ستمبر ماہِ حال، کو ارسال ہوئے ہیں، نظرِ انور سے گزرے ہوں گے۔ فقط

اُردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے۔ فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔ بعدِ اتمامِ تحریر نذر کیا جائے گا!

بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی و اُردو، سراسر دیکھا ہوا میرا، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا، غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہوگیا۔ دو تین غزلیں، فارسی، ہندی، جو لکھی ہیں، اُن کا[۳] انتخاب بھی پہنچے گا ۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسد اللہ بیدستگاہ

دو شنبہ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

(۷۳/۲۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ خاطرِ اقدس میں نہ گزرے کہ غالب، تعمیلِ احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں فتورؔ، ہاتھ میں رعشہؔ، حواس مختلؔ، ناچار کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں! بارے ایک دوست نے کاتب کا نشان دیا۔ اردو کا دیوان، اشعار پر صاد کرکے، اُس کو حوالے کیا۔ کل وہ اجزای منقولہ آئے۔ آج بطریقِ پارسل مع اس عرضی کے ارسال کیے۔

خط کاتب کا مجھ کو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئے گا! اغلاط اتنے نکلے کہ مجھ کو تحریر کے برابر محنت پڑی۔

فارسی کے کلیات کا شیرازہ کھول کر، اجزا اُس کے احباب پر تقسیم کر دیے ہیں، جابجا اشعار پر صاد کر دیے ہیں۔ وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعدِ اتمام وہ بھی پیشکش کروں گا زیادہ حدِّ ادب ۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترحم کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

[میرزا صاحب نے تقریظِ شرح بدرِ چاچ کی اصلاح کے سلسلے میں چہار شنبہ ۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو ایک عریضہ روانہ کیا تھا۔ مثل میں اُس کا صرف لفافہ موجود ہے۔ اس کی پشت پر میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "اصلِ خط درحضور پُر نور، کہ بمقدمۂ تقریظِ شرحِ بدرِ چاچی بود، ماند۔ ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء"][1]

(۷۴/۳۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اُردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں یقین ہے کہ حضرت کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو۔ آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریقِ پارسل اِس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ اور بھائی ضیاء الدین خاں بہادر نے جو اوراق میرے پاس بھیجے ہیں، وہ بھی اسی پارسل میں رکھ دیے ہیں۔[2] حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لٹ گیا۔ بعدِ غدر جو کچھ کہا ہے، وہ یہی ہے جو پہنچتا ہے۔

اِس درویش نے صرف غزلوں[3] اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو، تو وہ بھی بھیجوں۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

(۷۵ / ۳۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشور مکرمت [illegible]
بابت تنخواہ ماہ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ معرفت [illegible]
اُردو پہنچے۔ خدا کرے، پسند آئیں! [illegible]
حال سامعۂ اقدس پر عرض نہ کیا! [illegible]
عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے [illegible]
اس میں ہے کہ قرضِ باقی ماندہ ادا ہو جائے [illegible]
حاجت نہ پڑے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! [illegible]

اسد اللہ بید ستگاہ [illegible] شنبہ اکتوبر سنہ [illegible]

(۷۶ / ۳۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے
اِس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ [illegible]
از آن مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است [illegible] ذلیل کو عزت دینی اور دکان
بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا اُستاد اور پیر و مرشد
اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا
چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ چنانچہ مراد بر آئی اور
اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر
کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبان
پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اِس امرِ خاص میں [illegible] طمانیت حاصل ہے۔
مگر دعوئ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریق یاد نہیں۔

میاں اِنجو، جامعِ فرہنگِ جہانگیری،[۱] شیخ رشید، راقمِ فرہنگِ رشیدی[۲] عظمای عجم میں سے نہیں۔ ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی اِن کا اِن کا قیاس، ٹیک چند[۳] اور سیالکوٹی مل[۴] ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی۔ نورٌ علیٰ نور!

فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات اُن کے کلام میں ہیں، اُن کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں؟ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارتنگ دار زرنگ" متحد المعنی اور "آشیان ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا؛ لیکن نہ اُن صاحبوں کے قیاس کے بموجب، بلکہ اپنے خداوندِ نعمت (کے)[۶] حکم کے مطابق۔[۵]

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

انصاف کا طالب، غالب۔ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

(۶۷/۳۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج سہ شنبہ، ۱۶ ماہِ اکتوبر کی، دن کو بارہ بجے کھانا کھا کر بیٹھا تھا کہ توقیعِ رفیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اُٹھا، اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو تو مجھے جنابِ الٰہی اور حضرتِ رسالت پناہی کی قسم! اگرچہ فاسق و فاجر ہوں، مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ خدا و رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرای ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی، اور باہم جو اُن کی عقلوں میں اختلاف ہیں، اُن میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اور دل سے

مجھے بحث نہیں۔ باہمہ ضعفِ حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان دونوں باتوں کو میں نے مانا، لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب، بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔ یہ کلمہ موجبِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کو گناہ سمجھا جائے ؎ آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
گناہ معاف کیجیے، اور نویدِ عفو سے مجھ کو تقویت دیجیے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عفو کا طالب غالب

(۴۸/۳۴)

۱ حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضور کے لشکرِ نصرت اثر کا سپہ سالاری نواب معلی القاب، جناب مہدی علی خاں بہادر[2] اکبر آباد پہنچنا، اور خیامِ فلک احتشام کا وہاں نصب ہونا، اور رامپور سے اکبر آباد تک گھوڑوں کی ڈاک کا بیٹھنا اور حضرت کا سنبھل تک بسبیلِ ڈاک تشریف لے جانا، اور وہاں مزاجِ اقدس کا ناساز ہونا اور دارالسلطنت کو معاودت فرمانا، یوماً فیوماً مسموع ہوا۔ غرض اس عرضداشت کی تحریر سے یہ ہے کہ حصولِ جواب سے آبروئے اور خیریت و عافیتِ مزاج مبارک سے عزِّ اطلاع پاؤں[3]۔ فقط

[4] اخبار میں مسطور اور شہر میں مشہور ہے کہ حضرت اجلاسِ کونسل کے واسطے حسب الحکم گورنمنٹ کلکتے کو تشریف لے جائیں گے۔ نمک خوارِ دعاگوئی و مدح گستری میں بہانہ طلب رہتا ہے۔ اس تقریب کا ایک قطعۂ تاریخ سنہ ۱۸۶۶ عیسوی رقم کیا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو اجازت ملجائے کہ اس کو کسی اخبار میں چھپوا دوں[4]۔ فقط

قطعہ

چو نوّاب، از پئے اجلاسِ کونسل   بہ کلکتہ از رامپور آورد رُخ

عدو را بگیرد بکُش زود دی را | بجو سالِ اجلاس از "بخت فرخ"
چو گویند کز کشتنِ دی چہ خواہی | بگو: حذفِ اعدادِ "دی" اینت تاریخ!

"اینت" لغتِ پارسی ہے، مرادفِ "خہی و زہی" اور قتل کا مشار الیہ لفظِ "دی" ہے، جس کے ۱۴ عدد ہیں، اور "دی" کا مشار الیہ عدد ہے "بخت فرخ" کے ۱۸۸۲ جب اس میں سے ۱۴ کم کیے، تو ۱۸۶۶ رہے۔
زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
(۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء)

(۷۹/۳۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رفیع مع ہنڈوی تنخواہِ نومبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی عزِّ ورود لایا۔ سو رُپیہ معرضِ وصول میں آیا۔

قطعۂ تاریخ کے باب میں التماس یہ ہے کہ اب قوّتِ ناظمہ پر تصرف اور معنی آفرینی کا زور مطلق باقی نہیں۔ مگر از راہِ فرطِ ارادت و محبت ثنا و دعا کے واسطے تقریب ڈھونڈھتا ہوں، جب موقع پاتا ہوں کچھ عرض کرتا ہوں۔ تخرجۂ لطیف ہاتھ آ گیا، اُسی پر مدعا کی بنا رکھی۔

پیر و مرشد، اگر غازی آباد سے حضور ریل پر سوار ہوں، تو فقیر کو تاریخِ ورودِ غازی آباد سے آگہی ہو جائے، تاکہ میں وہاں حاضر ہو کر قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضہ نگار اسد اللہ

۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

(۸۰/۳۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ایک عرضداشت بھیج چکا ہوں۔ اُس کا جواب نہیں پایا۔ امید وار ہوں کہ اس عرضداشت کے جواب سے محروم نہ ہوں۔ فقط

کل دن کو دس بجے سنا کہ عالی جناب نواب مہدی علی خاں بہادر سواری ریل آئے، اور اہلی کے محلے میں ٹھہرے ہیں۔ کھانا کھا کر فوراً سوار ہوا۔ وہاں جا کے سُنا کہ نواب صاحب ریل کے اسٹیشن پر گئے ہیں۔ گھنٹا بھر بیٹھا رہا کہ حضرت آئے۔ آگے غازی آباد کے اسٹیشن پر سے سواری ہوتی تھی۔ اب ولی محمد سوداگر کی کوٹھی[۱] کے پاس سے[۲]، جو بیگم کے باغ[۴] کے عقب ہے، نیا اسٹیشن قرار پایا ہے[۵]۔ سو صاحبزادہ صاحب نے آپ کے حضور میں اطلاع کی ہے۔ دیکھیے حضرت غازی آباد سے سوار ہوتے ہیں یا شہر میں سے؟ واسطے خدا کے! مجھ کو اپنے روزِ ورود و وقتِ ورود سے اطلاع بخشیے، اور اس عرضی کا جواب ایسا جلد عنایت ہو کہ فقیرِ بے سر و سامان اپنا سامان درست کر رکھے[۶]۔

حضرت کی توجہِ باطنی، جو ہمیشہ میری مصلحِ حال اور افزایشِ عزّ و وقار کی کفیل ہے، بعد ادائے شکرِ الٰہی اُس کا سپاس بجا لاتا ہوں۔

پیش از غدر گورمنٹ کے دربار میں ۷ پارچے، اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعدِ غدر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا[۷]۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباروں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہ تھا کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کاغذِ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سُن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر

بہادر شہر کو علم۔ بارے بروقتِ ملاقات، تعظیمِ معمولی اور مصافحہ کرکے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا، اور فرمایا کہ "یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔"[1] مالائی مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے بابت مرحمت ہوئے۔

دوشالا ۱، کمخواب کا تھان ۱، بنارسی تھان سنہری بوٹے ۱، بنارسی سیلا ۱، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ۱، کناڈیز[2] کا تھان ۱، الوان کی چادر بے کنارہ ۱۔

میں اس عطیے کو آپ کی بخشش معنوی سمجھتا ہوں، اور دوسری بخشش یعنی اس خط کے جواب کے جلد حاصل ہونے کا متوقع ہوں۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار !

عرضداشت کے جواب کا طالب، غالب

روزِ سہ شنبہ ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶

(۸۱/۳۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت !

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی صد روپیہ عز ورود لایا۔ دسمبر ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔

اللہ اللہ ! یہ فرطِ عنایت، یہ ظہورِ کرامت کہ حضرت ڈاک میں سوار ہونے کو ہیں اور میرے نام خط کا حکم ہو، اور وہ خط دستخط سے مزین ہو، دسمبر کی تنخواہ دسمبر ہی میں جاری ہو، اور جنوری کی تیسری تاریخ میرے پاس پہنچ جائے! ظہورِ آثارِ ربوبیت بوجہِ[3] احسن و اکمل ہے۔

(۸۲/۳۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت !

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضرت کا رونق افزائے کلکتہ ہونا از روئے شمار

رفتارِ ریل یقینی ہے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا کا موافق آنا، اور جناب لاٹ صاحب بہادر سے ملاقات کا ہونا، اور اجلاسِ کونسل کا وقوع میں آنا، ہنوز تک حضرت رقم نہ فرمائیں گے، دعاگو کے خیال میں کیوں کر آئیں گے؟ ناچار جرأت بہم پہنچا کر اس عرضداشت کے جواب میں ان حالات کے انکشاف کا امید وار ہوں۔[2] فقط

پیر و مرشد، حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا۔ تنخواہ نے قسط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔ ہم بدل و ہم بزبان ثنا خوانِ جود و نوال و دعاگوی دوامِ دولت و اقبال ہوں۔ آدھا قرض عطیۂ سابق میں، اور آدھا قرض عطیۂ حال میں ادا ہو گیا۔ کہہ نہیں سکتا، اور بن کہے بنتی نہیں اگر دونوں لڑکوں[3] کا پچاس[4] روپیے مہینا جنوری سنہ ۱۸۶۷، یعنی ماہِ حال و سالِ حال، سے جاری ہو جائے گا، اور ماہ بماہ فقیر کے روزینے کے ساتھ پہنچا کرے گا، تو آپ کا نمک خوار پھر کبھی قرضدار نہ ہوگا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

فیض کا طالب، غالب

معروضۂ ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷

(۸۳/۳۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بہت دن تک متردد رہا کہ حضور کلکتے ہیں یا رامپور۔ چنانچہ ایک عرضداشت اسی تردد میں بھیجی ہے۔ ہنوز جواب کے آنے کی مدت منقضی نہیں ہوئی۔ خیر، اس کے جواب پر کیا موقوف ہے؟ یہ تو جان لیا کہ حضرت رونق افزای رامپور ہیں،[1] مگر یہ کیونکر جانوں[5] کہ اب بہ خجستگی و فرخندگی یہیں رونق افزا رہیں گے، یا پھر کلکتے تشریف لے جائیں گے: خیر، اس بے علمی کو مہمل سمجھ لیا کہ جو کچھ ہو گا، معلوم ہو جائے گا، مگر یہ کیونکر جانوں کہ

مزاجِ اقدس کیسا ہے؟ اور جب تک یہ نہ جانوں تو آرام کیونکر آئے؟ یہاں سے رامپور تک برابر تار برقی بھی نہیں، جو خبر منگواؤں۔ آج ۱۴ فروری کی ہے۔ یہ خط بھیجتا ہوں۔ اگر جواب آئے، تو ۹ دن میں۔ مجھ کو اتنے دن صبر کیونکر آئے گا؟ الٰہی، آج یا کل کوئی نوازش نامہ خداوند کا آجائے!

زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر کا طالب، غالب

۱۴ فروری ۱۸۶۷

(۸۴/۴۰)

حضرت وَلیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھیجا، دو بار دو امروں کے تردد کے رفع کی التماس تھی۔ ایک یہ کہ پھر کالکنے کو تشریف لے جائیے گا یا نہیں؛ دوسرے یہ کہ مزاجِ اقدس کیسا ہے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ کل ہی دوپہر کو اخبار میں دیکھا کہ حضور نے بوجہ ناسازیِ آب و ہوای کالکنہ شمولِ کونسل سے انکار کیا۔ بارے اس سے خاطر جمع ہوئی۔ رہی مزاجِ مبارک کی حقیقت، اُس سے بھی فی الجملہ طمانیت ہو گئی۔ یعنی عنایت نامے میں خیر خواہ کے خلافِ مدعا کوئی بات مندرج نہ تھی۔ اسی عرضی میں یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ سو روپیے بابتِ تنخواہِ جنوری سنہ ۱۸۶۷ حال میں نے پائے اور شکرِ درویش پروری بجا لایا ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

عنایت کا طالب، غالب

۱۵ فروری ۱۸۶۷

(۸۵/۴۱)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ عطوفت عزِّ ورود لایا (سو روپیہ تنخواہ[1] فروری سنہ ۱۸۶۷ حال کا معروضِ وصول میں آیا۔

اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے دورانِ سر، اور رعشہ، اور ضعفِ بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں[2]۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

زیادہ حدِّ ادب۔

نجات کا طالب، غالب

۱۳ مارچ سنہ ۱۸۶۷

(۸۶/۴۲)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو دو گھڑی دن چڑھے نوروز ہے۔ آج یہ قطعہ ہاتھ[3] تھام کر لکھ کر حضور کی نذر بھیجتا ہوں ہے

نوروز و عید از دو جانب اِمسال خوب ست زروئے ضع و نیک ست بفال

امید کہ این سہ عید، نذرِ نواب آرند دوامِ عمر و عزّ و اقبال

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

چہار شنبہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۶۷

(۸۷/۴۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم و تعظیم معروض ہے۔ ہنڈوی ملفوفۂ نوازش نامہ کے ذریعے سے سو روپیے مارچ کی تنخواہ کے وصول ہوئے۔

ایک رباعی بھیجتا ہوں، اور یہ چاہتا ہوں کہ دبدبۂ سکندری کے آغاز میں اس کے چھاپنے کا التزام رہے!

آن کیست کہ جسم ملک را جان باشد؟ آن کیست کہ ہمسر سلیمان باشد؟
آن کیست کہ انجمش بفرمان باشد؟ کس نیست، مگر کلب علی خاں باشد

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۶ اپریل سنہ ۱۸۶۷

(۸۸/۴۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ نمایشگاہِ سراسر سورِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں[۲]، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے، میں وہاں نہیں! بالا خانے پر رہتا ہوں، اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اُتارا اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا، اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بینظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے؛ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے؟ بارے تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو میں خوشنودیِ مزاجِ مبارک سے اطلاع پاؤں[۳]۔

نمایشگهی در خور بہ شانِ خویش | برآراست نوابِ عالی جناب
بہ بین، چون طرب را نہایت نماند | بود سالِ آں "بخششِ بیحساب"
خدایا! پسند خداوندگار | کہ از طبعِ غالب رود تیغ و تاب

"بخششِ بیحساب" کے بارہ سو پچاسی ہوتے ہیں، "طرب" کی نہایت باے موحدہ ہے۔ جب وہ نہ رہی، تو دو عدد گھٹے، اور ۱۲۸۳ رہ گئے۔ حضرت کی مرضی ہو، تو دبدبہ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۴ ماہِ اپریل سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

(۸۹/۴۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رفیع عزِ ورود لایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک! | دولت و عز و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

(۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷[۲])

(۹۰/۴۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ ادائے مدارجِ تسلیم سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں۔ ہے، ہے! میں کیوں جیتا رہا، جو صاحبزادہ محمد حسن خاں[۳] کے مرنے کی خبر سنوں، اور خداوندِ نعمت کو تعزیت کے کلمات لکھوں؟ میں نیم جاں نہ مروں، اور وہ نوجوان مر جائے۔

سرِ دِ چمنِ سروری افتاد ز پا، ہای![۵]

حضرت کے رنج واندوہ کا تصور اور مارے ڈالتا ہے۔ دوسری محرم کو علی بخش خاں خانہ آباں مرے؛ تیسری کو یہ واقعۂ ہوشربا پیش آیا۔ یہ تو آپ کا فرزندِ دلبند تھا۔ جو اس کا غم ہو، وہ بجا ہے۔ پر فقیر جانتا ہے کہ علی بخش خاں کے مرنے کا بھی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا۔ ایسے کارگزار، دیانتدار، ہوشمند، مزاج داں کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ بہرحال "رضینا برضاءِ اللہ" حضرت کے سامنے صبر و ثبات و تسلیم و رضا میں کلام کرنا ادریس کو حکمت پڑھانی اور خضر کو راہ بتانی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب ۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷

(۹۱/۴۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ورودِ توقیعِ وقیع سے فیض پایا۔ سو روپیہ مئی سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسد اللہ بیدِ سنگاہ

۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷

(۹۲/۴۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے کہ توقیعِ وقیع عزّ ورود لایا۔ اُس کی ملفوفہ ہنڈوی سے تنخواہِ جون سنہ ۱۸۶۷ کا سو روپیہ میں نے پایا۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب اسد اللہ

۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۷

(۹۳/۴۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بموجب تحریر مرزا رحیم الدین بہادر حیا[1] کے فاضل شطرنج باز[2] کو خرچ دے کر روانہ کیا ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

اسد اللہ بیدِ ننگاہ۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۷

(۹۴/۵۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم مدارجِ تسلیم نوازش نامے کے ورود کا شکر اور جولائی مہینے کے سو[ ]روپیے کے وصول کا سپاس بجا لاتا ہوں ؎

تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط
نجات کا طالب، غالب
۱۴ اگست سنہ ۱۸۶۷

(۹۵/۵۱)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آپ کے غلامِ زر خرید، یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی، یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے[3]، اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ[4] ہے ؎

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ مدعائے ضروری الاظہار
تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
نجات کا طالب، غالب

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۶/۵۲)

آن کیست کہ حشمِ ملک را جان باشد؟ آن کیست کہ ہمسرِ سلیمان باشد؟
آن کیست کہ انجمش بفرمان باشد؟ کس نیست، مگر کلب علی خان باشد

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزِّ ورود لایا۔ اُس میں یہ حکم مندرج پایا کہ حسین علی خاں کی شادی کے باب میں "خلاصۂ مکنونِ خاطر" عرض کروں۔ حکم بجا لاتا ہوں، اور عرض کرتا ہوں۔ مجملاً یہ کہ میں درِ دولت کا گدای خاک نشیں، اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک اور میرے گھر میں زیورِ زرینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں۔ ہست اُدھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تا یہ کام سرانجام پاے، اور یہ بڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جاے۔

دوسری بات یہ کہ سو روپیے آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور ۶۲ روپیے ۸ آنے مہینا انگریزی سرکار سے بعوضِ جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کِھلاؤں گا؟ حسین علی خاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جاے۔ لیکن توقیعِ تنخواہ اُس کے نام جاری نہ ہو، بلکہ اُس کی زوجہ، حسن جہاں بیگم بنتِ اکبر علی خاں، کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اُس کی مہری رسید سے ملا کرے۔ زرِ مصرفِ شادی کی مقدار، اور تنخواہ کی مقدار، جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت۔ زیادہ حدِّ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۷/۵۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عز ورود لایا۔ اللہ اکبر! حضرت نے غمخواری و تفقد و درویش نوازی کو اس پایہ پر پہنچایا کہ شاہانِ عجم میں سلطان سنجر نے اور شاہانِ ہند میں شاہجہاں نے ملازموں کی یہ پرورش اور نوازش کی ہوگی۔ باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ انھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپے دیے، اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپے صرف کیے۔ حسین علی خاں کا خسر، یعنی اکبر علی خاں، اپنے خاندان کا ہے، لیکن امیر نہیں نوکری پیشہ ہے۔ اب یہ میں کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو؟ سائل ہوں۔ رسم نہیں کہ سائل مقدار سوال عرض کرے۔ حال صرف شادی کا لکھ دیا ہے۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دو گے، اس میں شادی کر دوں گا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔ معروضہ ۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۲۸۴، مطابق ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۷، فردای ورودِ ہمایوں منشور۔

(۹۸/۵۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ فرمانِ والا مع ہنڈوی تنخواہ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ عز ورود لایا۔ سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

ترحم کا طالب، غالب

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷

(۹۹/۵۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ دبدبۂ سکندری میں حضرت کے مزاج کی ناسازی کا ذکر دیکھ کر جو مجھ پر گزری، میرا خدا جانتا ہے۔ مگر یہ بڑی بات ہے کہ اسی ذکر کے ساتھ افاقت و رفعِ مرض کی بھی نوید مندرج تھی۔ توقع ہے کہ حضرت مفصل حال مرض کے پیدا ہونے کا اور فی الحال مزاجِ اقدس کیسا ہے، میر منشی کو حکم ہو جائے کہ حضور کی زبانی خط میں مجھے لکھ بھیجیں!

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷

(۱۰۰/۵۶)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ایک قطعہ ۱۵ شعر کا بھیجتا ہوں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا۔ زیادہ حدِ ادب[۲]

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۵ رجب سنہ ۱۲۸۴ ہجری[۳]

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ

اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جانتے ہیں تو کم
رامپور، آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رامپور، ایک بڑا باغ ہے از روی مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِّ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آجائے، تو لے ان کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراق رقم
حق سے کیا مانگیے؟ ان کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نوّاب کو ہم
یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار رہے جن کا عالم

اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم!

(۱۰۱/۵۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آج روزِ جمعہ ۱۷ رجب ۱۲۸۴ھ اور ۱۵ نومبر ۱۸۶۷ء والا نامہ مع ہنڈوی تنخواہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ آیا۔ سو روپیے کل آئیں گے۔ ٤٥ شاگرد پیشہ اور لعہ قرضِ متفرقہ میں جاکر لعہ روپیے بچیں گے[1]۔ اللہ، اللہ، پیر و مرشد رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ ادھر سے جز سکوت جواب نہیں[2]۔

کئی دن ہوے کہ ۱۵ شعر کا قطعہ ارسال ہوا ہے۔ اُس کی رسید اِس خط میں مندرج نہ تھی۔ خاتمے کے تین شعرِ دعائیہ یہاں لکھتا ہوں۔ دعا کا نیا طور ہے۔

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
باخدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم!

نجات کا طالب، غالب

(۱۰۲/۵۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت![3]

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل ۱۶ دسمبر کو نومبر کی تنخواہ کی ہنڈوی پہنچی وہ بھی سعادت مند منشی سیلچند کے خط میں ملفوف۔ دیر میں ہنڈوی کا پہنچنا یک طرف

حضرت کے توقیعِ وقیع کے مشاہدے سے آنکھوں کا روشن نہ ہونا میری سیاہ بختی کی دلیل ہے۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۷

(۱۰۳ / ۵۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج روزِ شنبہ، یکم ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ ہے، بہ اتفاقِ حسابِ دوج و نگارشِ جنتری

روزِ روزہ است و روز ناپیداست غلظتِ ابر و شدتِ سرماست

چونکہ دھوپ تو نظر ہی نہیں آتی، ناچار دن رات آگ تاپتا ہوں، اور ہر وقت کانپتا ہوں۔

ماہِ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آئے۔ اور چونکہ اس ماہِ مبارک میں درِ فیض باز، اور سالِ انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ پچیس روپیہ مہینا جو زبانِ مبارک سے نکلا ہے، جنوری سنہ ۱۸۶۸ سے بنامِ حسین علی خانِ مذکور جاری ہو جائے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

لکھا ہوا یکم رمضان اور بھیجا ہوا دوم رمضان کا، عطا کا طالب، غالب،

(۱۰۴ / ۶۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ رافت عزِّ ورود لایا۔ ہنڈوی مع ملفوفہ سے

سو روپیہ بابتِ تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ معرضِ وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

توجہ کا طالب، غالب

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

(۱۰۵/۶۱)

داد و دہشِ تو روز افزون بادا! بر دولتِ تو زمانہ مفتون بادا!

این عید و دو صد ہزار عیدِ دیگر بر ذاتِ تو فرخ و ہمایون بادا!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۲۸ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ ہجری

(۱۰۶/۶۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت ظہورِ عزِّ ورود لایا، اور اُس کی ملفوفہ ہنڈوی سے جنوری سنہ ۱۸۶۸ حال کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

تم سلامت رہو قیامت تک ! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

۱۴ فروری سنہ ۱۸۶۸

(۱۰۷/۶۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

عرضِ مدارجِ عجز و نیاز کے بعد نوازشنامے کے پہنچنے کا اور تنخواہ فروری سنہ ۱۸۶۸ کے پانے کا شکر بجالاتا ہوں۔ سبحان اللہ! کیا برکت ہے اس سو روپیے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں، اور اس فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں۔ مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیۂ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے، تو

آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے، خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا، تو اُس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا! غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت، کوئی ایسا نہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا رہے، اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۹ مارچ سنہ ۱۸۶۸[۱]

(۱۰۸/۶۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے منشورِ عطوفت ظہور عزِّ ورود لایا۔ سو روپیہ کا کاغذ[۲] خط کے لفافے میں سے پایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۸ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(دوشنبہ ۱۱ ماہِ مئی سنہ ۱۸۶۸)[۳]

(۱۰۹/۶۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے، شوقِ قدمبوس نے تنگ کیا۔ جب دیکھا کہ کسی طرح جا نہیں سکتا، ناچار اپنا نقشا اُتروایا، اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہیں جیتا ہوں، تب تک اس صورت سے حاضر رہوں گا۔ زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب

۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸[۴]

(۱۱۰/۶۶)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ توقیعِ وقیعِ عزّ ورود لایا ہے۔ ہنڈوی ملفوفہ کی رو سے تنخواہِ مئی سنہ ۱۸۶۸ کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا ہے۔ جواب کے جلد نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں گرمی کی شدّت کے سبب سے اور احتباسِ ہوا سے کہ جو لازمۂ موسمِ برسات ہے، بیکارِ محض ہو گیا ہوں مطلق کچھ لکھ نہیں سکتا؛ اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں، اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا۔ آج اس وقت ایک صاحب آگئے۔ اُن سے مَیں نے یہ عریضہ لکھوا لیا۔

پیر و مرشد، سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے۔ اُس کی رسید اس نوازش نامے میں مرقوم نہ تھی۔ مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو۔ اگر اُس کی رسید سے شرفِ اطلاع پاؤں، تو دلجمعی ہو جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۸ء، نجات کا طالب، غالب

(۱۱۱/۶۷)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل منشورِ عطوفت عزِّ صدور لایا۔ جولائی سنہ ۱۸۶۸ کا سو روپیہ بذریعۂ ہنڈوی وصول پایا۔

تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں۔ سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ اِن شاء اللہ الکریم، حسبِ ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں آمدِ زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا، اور حسین علی خاں

کی شادی بھی ہو جاوے گی، اور اُس کے واسطے اُس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جاوے گی ؎

باکریمان کارہا دشوار نیست! فقط

عرضداشت ہوا خواہ، اسداللہ۔ معروضۂ ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۸

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت وعزّ و جاہ روزافزوں!

(۱۱۲ / ۶۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیمِ مدارجِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت عزّ ورود لایا ہے۔ ہنڈویٔ ملفوفہ کے ذریعے سے بابتِ تنخواہِ اگست ۱۸۶۸ سو روپیہ وصول پایا

نکھوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ مدعا ہی ضروری الاظہار

پیر و مرشد! حسین علی خاں کے سُسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ بطریقِ "شیئاً للہ" سوالِ مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجے؛ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشت دولتخواہ، اسداللہ

معروضۂ ۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۳ / ۶۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع سو روپیے کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ تنخواہِ ستمبر ۱۸۶۸ کا سو روپیہ میں نے پایا ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت وعزّ وجاہ روزافزوں!

مشتاقِ مرگِ ناگاہ، اسداللہ

۱۳ ماہِ اکتوبر ۱۸۶۸

(۱۱۴/۷۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت شرف ورود لایا۔ ما عصر روپیہ بابت تنخواہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ از روی ہنڈوی ملفوفہ خطِ معرض وصول میں آیا۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے! مجھ سے اپاہج نکمے کو بعوض خدمت تنخواہ دیتے ہو

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسد اللہ، معروضہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۵/۷۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل عریضۂ مشعرِ رسیدِ تنخواہِ نومبر سنہ ۱۸۶۸ حال ارسال کرچکا ہوں۔ آج ناچار از روی اضطرار و افتقار پھر یہ عرضی لکھتا ہوں۔ حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے للعہ روپیہ بھیجا۔ ہدیہ روپیہ کا چھٹا ماہوار کا۔ سود سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپیہ ہوں، تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اُس کے نام کی تنخواہ سے قطعِ نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال؟ کبھی نہ کہوں گا آٹھ سو روپیہ مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے برخوردار نواب مرزا خاں کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے۔ وہ عرض کریں گے مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ مگر حضور، جو عطا فرمانا ہے، جلد ارشاد ہو۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عرضداشتِ گدای یک درگاہ اسد اللہ مضطر

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۶/۷۲)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے مجھ کو مبارکباد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔ سو میں نے اُن کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائے گا۔ اس تحریر سے یاد دہی منظور ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آرام کا طالب، غالب

صبح پنجشنبہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء

(۱۱۷/۷۳)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ اور اُس میں تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء کی ہنڈوی ملفوف پہنچی۔ جلد یاد آوری کا شکر بجا لایا۔

حضور قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ غالبِ گدیہ خواہ مرقومۂ روزِ یکشنبہ

او اخرِ تاریخ رمضان المقدس سنہ ۱۲۸۵ھ

.:(✻):.

"بخدمتِ نواب صاحب مشفق و مکرم، مظہرِ لطف و کرم، نواب زین العابدین خاں صاحب بہادر عرف کلن میاں، سلمہ اللہ تعالےٰ، مقبول باد"[۱]

(صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں ولد صاحبزادہ سید اصغر علی خاں بہادر ولد نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابنِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے ہمجد اور رشتے میں حقیقی چچا زاد بھائی کے بیٹے تھے تقریباً ۱۲۴۸ھ میں دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے دادا نواب سید عبداللہ خاں بہادر کی صدر الصدوری میرٹھ کے زمانے میں اُن کے ساتھ رہے۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں رامپور آئے۔ ان کے بڑے بھائی صاحبزادہ سید محمد رضا خاں بہادر کو نواب فردوس مکاں کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ سوءِ اتفاق سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ صاحبزادہ کلن میاں نے سرکار کی اجازت کے بغیر ۱۲۸۲ھ میں بھاوج سے عقد کر لیا اور رامپور سے ترکِ وطن کر کے جیپور چلے گئے اور وہیں توطن اختیار کر لیا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے:

"عابد۔ صاحبزادہ محمد زین العابدین خاں عرف کلن خاں ولد صاحبزادہ محمد اصغر علی خاں اصغر۔۔۔ بیالیس برس کا سن ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں یطور خود کہتے ہیں۔ یہ اُن کا کلام ہے:

تھا جو اوڑنا ہی ہوش کو میرے ۔۔۔ یو ہی گیسوے عنبریں ہوتا

تھا نہ کھلنا جو عقدۂ دل کو ۔۔۔ کاش، ابرو کی نیرے چیں ہوتا

ان کے دادا میرزا صاحب کے مخلص دوست تھے، اس لیے یہ میرزا صاحب کے

اپنا بزرگ اور وہ انھیں اپنا فرزند خیال کرتے تھے۔ لیکن نواب فردوس مکاں ان سے ناخوش ہو گئے، تو میرزا صاحب نے ان کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا۔ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر نے جیپور میں دسمبر ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ انتخاب یادگار: ۲۱۲؛ ملخص تسلیم: ۹۶؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۹۹۴]

(۱۱۸/۱)

بندہ پرور! مہربانی نامہ پہنچا۔ میں تو سمجھا تھا، آپ مجھ کو بھول گئے۔ بارے، یاد کیا۔ جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدردان اور میرے اُمیدگاہ ہیں۔ میں اگر رامپور نہ آؤں گا، تو کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تجھ کو آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، توقف ہے۔ وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر[۲] کے وہ درخواست حوالے ہوئی۔ صاحب کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر[۳] شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے، تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا نہ رہے، رینو بورڈ کے دفتر، اور لفٹنٹ گورنری آگرہ، اور نواب گورنر جنرل کلکتہ کے دفتر اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں۔ اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بے جرم اور بری اور الگ ہونا فساد سے از روی دفتر قلعہ و اظہار مخبرین ظاہر ہے۔ بہرحال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر، چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعد ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں؟ مگر تا صدورِ حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں، بعد ملنے حکم کے، خواہی دلخواہ ہو خواہی مخالفِ مدعا، دونوں صورت میں، رامپور آؤں گا۔ مگر حیران ہوں کہ جب تک یہاں رہوں، کھاؤں کیا، اور جب چلنے کا قصد ہو، تو رامپور کس طرح پہنچوں! کیا خوب ہو کہ تم یہ رقعہ اپنے نام کا حضور کو، یعنی حضرت نواب صاحب کو، پڑھوا کر اس مدعای خاص کا جواب جو وہ فرمائیں، مجھ کو لکھ بھیجو! لیکن تم سے یہ توقع

کیونکر پڑے؟ کس واسطے کہ تم نے اُردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال جنابِ عالی سے دریافت کر کر کب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھو گے زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ از غالب نگاشتہ و رواں داشتہ، پنجشنبہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء۔ ضروری جواب طلب!

(۱۱۹/۱)

نواب صاحب، والا قدرِ عظیم الشان، سلمکم اللہ تعالیٰ!

بعدِ سلام مشہودِ خاطرِ عاطر ہو۔ سابق آپ کا خط متضمن اُردو کے استفتائے روزمرہ کا آیا تھا۔ اُس کا جواب جو مجھے معلوم تھا لکھ بھیجا۔ اب جو دوسرا خط آیا، اُس میں آپ نے اپنے اشعار بتوقعِ اصلاح بھیجے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خاص خدمتِ اصلاحِ اشعار پر جناب نواب صاحب قبلہ کا نوکر ہوں، اور آپ حضور کے عزیزوں میں اور فرزندوں میں ہیں؛ پس میں بے حکم حضور کے آپ کی خدمت بجا نہیں لا سکتا۔ ناچار کاغذِ اشعار مسترد بھیجتا ہوں۔ یہ امر یقین ہے کہ موجبِ ملالِ اقدس نہ ہوگا۔ بندگی بیچارگی۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں، کہ مدعای ضروری الاظہار اسی قدر تھا۔ والسلام۔

راقم اسد اللہ خاں غالب ۱۸ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

بنامِ صاحبزادہ سیّد محمد عبّاس علی خاں صاحب بہادر

[صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بہادر ابن سید محمد عبدالعلی خاں بہادر، ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے ... میں تپاں زاد بھائی اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ تقریباً ۱۲۲۴ھ (ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۰ء تک دہلی میں قیام رہا۔ نہایت پاکیزہ سرشت، خوش مقال اور کمالات ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں ممتاز، اور ہمچشموں میں خوش فکری کی بدولت سرفراز تھے۔ عاشقانہ اور معاملے کے شعر خوب کہتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے اور برابر بذریعۂ مراسلت اصلاح لیتے رہے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد حاکم صدر بنائے گئے اور فروری ۱۸۸۳ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ محکمۂ صدر میں عدالتی خط و کتابت اور کاروبارِ ریاست انجام پاتا تھا۔ انھیں اس زمرے کے کام کا بڑا تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔

بتاریخ ۲۹ رجب سنہ ۱۳۰۰ھ (۶ جون سنہ ۱۸۸۳ء) کو دوپہر کے وقت فوت ہوئے۔ دیوان گلدستۂ باغِ جناں کے نام سے شعبان ۱۳۰۱ھ میں چھپ چکا ہے۔ کتاب خانے میں متعدد قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں۔ انھیں میں وہ نسخہ بھی ہے جس پر میرزا غالب کے قلم کی اصلاحیں ثبت ہیں۔ انتخاب یادگار: ۲۷، اخبار الصنادید: ۱۷۳، خم خانہ]

(۱۲۰/۱)

قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے؛ اور جس کو کاٹ دیا، وہ معیوب ہے؛ اور جس پر صاد نہیں، وہ بے عیب اور ہموار؛ اور جس کے معنی ہیں مجھے تامل ہے، اُس پر نظر، علامت اُس کی نقطہ۔ باقی جابجا حسبِ اقتضاءِ اصلاح اور حقیقت الفاظ لکھ دی ہے۔ تین جزو، جس میں سات ورق سادے ہیں، پہنچتے ہیں۔ اور اجزا بھیج دیجیے!

مرے دل کی ذرا سی پھانس کیا ہی رو برو سکے
اُکھاڑا ایک ہی حملے میں ہو و جس نے خیبر کا
تھا

~~ہوا یوں دین اصحاب رسول اللہ سے شائع~~
ہوا دینِ نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شائع
کہ نکلے چوک میں سے جس طرح بازار چوسر کا

ہیں تو ہم اس کے بیہودہ بکنے پہ سر دھنتا رہا
بیہدہ
ناصح ناداں یہ سمجھے کچھ پشیماں ہو گیا

اُف رے گرمیٔ تپِ عشق کہ جل کر نکلا
رگ سے جب سوختہ جاں کے ترے خنجر نکلا
دل

یہ بخت کی امداد ہے، یا یاد کی تاثیر؟
بھولے سے کبھی واں ذکر ~~ہمارا~~ نہیں ہوتا
تمہارا

پھر مجھ کو کچھ خبر نہیں، آگاہ ہے خدا
پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب
تو

نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی اُن پر
دیکھنے میں تو ہے اس طرح کی بھولی صورت
طور

~~تمکو کیا چاہیے، نہ اک خلق کو مار ڈالو~~
خلق کے قتل سے کیا فائدہ؟ بس شکر کرو
کیا قیامت ہوئی اگر ہو گئی اچھی صورت

~~نشہ ... خم گردوں اُلٹ گیا~~
باقی رہا نہ بوند صبوحی کے واسطے
ساقی نے کس قدر ہی گلگوں پلائی رات

بیخود ~~ہیں~~ اور وہ محوِ خیالِ رقیب تھے
ہیں بیخود
تھی وصل میں بھی وہ ہی جدائی تمام رات

~~قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لیے~~
قاتل لگا رکھا ہے تری تیغ
~~تھی ورنہ عاشقوں کو نہ کچھ سر کی احتیاج~~
مقطع بیتاب کو اگرچہ نہ تھی

کیا رحم کھا کے میری سفارش کچھ اُس نے کی
یہ ہم جو ہے رقیب سے بھی یار کا مزاج
ہے جو

دربان نے تیرے گور میں پہنچا دیا مجھے! — اے چارہ گر بتا ہمیں کر دوں کہاں ترا علاج
کہ

عادل ہے تو تو شک نہیں کچھ اس میں ابجدا — ڈالی ہے کس مراد پہ تو نے بنا کے چرخ
لیکن

آپ چل کر کہو احوالِ دلِ اُستے بیتاب — ~~کس کی دوات، قلم کیسی، کہاں کا کاغذ؟~~
اُس سے — کیا قلم، کیسی دوات، اور کہاں کا کاغذ؟

ہوتی ہے جو خلق پہ بس اب نہیں ہو جائے گی — فتنۂ محشر ہوا قربان تری رفتار پر
صدقے

دشمنوں کا اور فلک کا بھی ہیں اب مشکور ہو لیا — خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم مرے آزار پر
ممنون

آتشِ فرقت سے اک شعلہ ہو وہ دل ہی نہیں لیا — ہاتھ رکھتا اب مرے سینے پہ، دلبر، دیکھ کر
کا

لکھ دیا لکھنے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آ گیا — رد دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر ۴۴

آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب

طبعِ رسا نے اپنی دو بالا کیا اُسے — پہنچا تھا مرتبے کو نہ اپنے سخن ہنوز
میری

بیتاب کو کسی نے جو پوچھا تو بولے وہ — ہاں خاک پہ پڑا تو ہے اک خستہ تن ہنوز
پوچھا

سخت جانی، تجھے اللہ کی مار، او ظالم — پھر گیا، زندہ مجھے دیکھ کے دلبر یوں ہی
چھوڑ

خدا کرے! ترے پیکانِ تیر کو تو صنم — پسند آئے دلِ بیقرار کی آغوش
ظالم

ہے مرے دوست کا بھی دشمنِ جاں وہ ظالم — ہر نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص

دوست یعنی معشوق ۔ دشمن یعنی رقیب ۔ رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے دشمن جان نہیں ہوتا ۔ انا کہ وہ رقیب معشوق کا درپردہ دشمن ہے ۔ پھر اس عاشق نے اپنے معشوق کے عدو سے اخلاص کیوں نکالا ؟ خدا جانے اس شعر کی فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا ۔ غالب

دوستی اپنی، خدا کے لیے کہہ کر رکھیے ۔ نہیں بھاتا ہے مجھے ناصحو اتنا اخلاص

~~شاعری کی نہ کیا ہے بختری کیا چال~~ ~~پہنچا دست یار تک تو ہی پرورد گا حفظ~~

یہ گستاخی بے مزہ ہے

وسے داد دل، وگرنہ یہ دونوں ہیں یار بلا ۔ کرتے ہیں آہ و نالہ نزار اے خدا لحاظ

ہاں اس میں نکتہ ہے

دیوانہ ہے وہ کون جو دن کو جلائے شمع ۔ خورشید رو کے سامنے کیا کوئی لائے شمع

اس مہر وش

~~پروانہ حال نہ کہیے مجھے شرم آتی ہے~~ ۔ میں مبتلا ہوں آپ کا، وہ مبتلائے شمع

پروانہ مجھ کو کہتے ۔ ؟ تم کو حیا نہیں ؟

دیکھو یہ چھیڑ، ہم سے وہ غیروں کے سامنے ۔ انجان بن کے پوچھتے ہیں کیا جلا ہے چراغ

کہ

درماں کرے گا دیکھ تو کس کس کا چارہ گر ۔ ہیں زخم و آبلے بھی تو دل پر سوائے داغ

ہے تو زخم اور آبلہ

~~دامن تو~~ بھاگ نکلے یقیں ہو مجھے اگر ۔ دو دن سے مرا گلا تری شمشیر کی طرف

اُلٹی دہ

اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہے تجھ پہ کیا قلق ۔ جب قابل بیان نہ اپنا رہا قلق

تجھ کو

اتنا کسی سے وصل میں ہوگا نہ عیش بھی ۔ جتنا کہ تیرے ہجر میں ہم نے سہا قلق

کو

دل کو، جگر کو، پھونکے ہی دیتا ہے ہائے عشق! — اک آگ، کاش سینے میں جلتی بجائے عشق!

ہوتی

~~کیا سختیوں سے جان وہی بیتاب نے، مگر~~ — نکلا نہ شکوہ منہ سے کبھی جز ثنائے عشق

دی جان کس عذاب سے بیتاب نے، گر

ناچیز اس کو جان کے یہ نالۂ سحر — الٹا پھرا کہ ~~جا کے~~ لگا آسماں تلک

ادھر، نہ گیا

چھوڑا ہوا جو پہنچے، تو وہ ہنس کے کہتے ہیں — ہاں، اب ذرا ستانے کے قابل ہوا ہے دل

پکا کے

~~کیا~~ [illegible] کی تو ہی بتا دے، محتسب — ڈھونڈتے پھرتے ہیں میخانے کو ہم

ہے کدھر

قیس و فرہاد کا گو عشق میں کچھ نام ہوا — لیک بیتاب کی مانند ~~تو~~ مشہور نہیں

وہ

جھنجلا کے بولے ~~جان بھی نہیں اب~~ نہیں عزیز — کہہ بیٹھے اُن کو جان جو اک بار پیار میں

جان نہیں کیا

بیتاب کا بھی رند و، معلوم ہے پتا کچھ؟ — ~~اُس کو بھی~~ دیکھتے تھے اکثر اس انجمن میں

ہم اس کو

شکوہ ہے کیا، قبول گر اپنی دعا نہیں! — اس درد کی خدا کے یہاں بھی دوا نہیں

بھی مگر نہیں

کیا بزم رفتگاں میں خموشی کا رسم ہے! — ہیں جمع کس قدر، پہ کسی کی صدا نہیں

کی

پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ لگا لی؟ خدا سے ڈر — ظالم، ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

نکالی

لکھیں نہ نامے میں ~~ابھی [illegible] شوق حسرت~~ وصل — ہم اپنے سر کو تو ہر دم قلم سمجھتے ہیں

کیوں شوق سجدہ در دست

~~اُنھیں تو وصل کا اک دم بھی ہزار برس تھا~~ — ہزار سال کو ہم ایک دم سمجھتے ہیں

ہے ایک دم ہزار برس

~~الماس نمک نہیں~~ تیرے مرہم ہیں چارہ گر — پھر کیوں ہیں زخمِ دل کو عبث ~~سے~~ مزا کرو

ہر گز نمک

ہوا شق ~~جلوۂ جاناں سے وہ بھی~~ — کیا گر ماہ نے ٹکڑے کتاں کو

وہ بھی انگشتِ نبی سے

مسیحائی نہ دیکھی ہو ~~تو میرے~~ — ~~جنازے پہ سے~~ آؤ دل ربا کو

گر اس کی — مری تربت پہ لاؤ

بھا گیا اپنے زلیس قتل کا ایسا ہم کو — بعدِ مردن بھی تھا مرنے کی تمنا ہم کو

ہے

عشق نے دم ہی پہ بیتاب بنا دی آخر — کسی صورت ~~سے بھی کافر~~ نے نہ چھوڑا ہم کو

ستمگر

ننگِ عریانی ہو کیوں قطعِ نظر سوئے سینے — جبکہ اللہ نے پیدا کیا عریاں مجھ کو

وحشت

~~مقتضائے بشری صبر بھی تھا اے اللہ~~ — یہ بھی دینا تھا، بنایا تھا جو انساں مجھ کو

مقتضیاتِ بشر میں سے نہ تھا صبر، مگر؟

۴ دیکھ جا میں بت کو لگے پڑھنے اسی کا کلمہ — ~~واعبداللہ یا خفیہ ہی~~ ایماں مجھ کو

میرے خالق نے دیا ہے عجب

(۱) ہزار صبر کرو، لاکھو بے قرار رہو — مگر وہ چیز ~~ہے الفت~~ کہ آشکار رہو

نہیں — محبت

بڑے ادب سے جسے قیس نے کیا سجدہ — ~~کسی سے پوچھو تو کہتا ہے~~ وہ مزار ہو

کہیں یہ حضرتِ بیتاب کا

بہانے ہیں تو دو دریا بہا ہیں چشمِ تر دونو — فغان و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہے بے اثر دونو

"دونوں" میں نون ضرور ہونا چاہئے - اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھو

کیونکہ منہ رکھے وہ میرے سینۂ پُر داغ پہ — بوے گل ہے خاطرِ نازک پہ جس کی بار بھی

حق تو یہ ہے خوب ہی دی غیر کو فرقت مگر — یا وفا کیونکر بنا تے اُس کو تم لاچار ہو

لاچار غلطِ محض ہے۔ ناچار بہ نون صحیح ہے۔

نکلی دل و جگر کو مگر آہ توڑ کے — سینہ سے شب جُدا یہ ہوا خوں میں بھر کے سینے

آواز اُس سنگدل کی شبِ وصل گم ہو گئی — گویا ہماری موت تھی مرغِ سحر کے ساتھ

خانۂ آئینہ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی — دیکھ رکھ دیتا ہے جب وہ مہ شمائل آئینہ کر رکھتا

بوسہ ملا، نواب یہ ہوس ہے کہ عمر بھر — یونہی ملا رہے رکھے دہن کو دہن کے ساتھ

مجھ کو بے کاسا عطر ہے اُس کے شبینہ ہار کے گلے کا — بو ہی پڑ ان ملی ہے جو بو ہی بدن کے ساتھ

جاں کنی ہی ہو رہے، اب تک آپ اس تو نہیں پھر — حشر میں ہو وے گی اُس سے ایک صحبت اور بھی

گریہ و زاری کو جو روکا، تو سودا ہو گیا — ہو گئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

میں نے اس شعر کو ناحق کاٹا۔ "جو روکا" یہ لفظ مکروہ تھا۔ جو کی جگہ جب لکھ دیجیے۔ شعر صاف اور بے عیب ہو جائے گا۔ غالب

گریہ و زاری کو جب روکا، تو سودا ہو گیا — ہو گئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

قتل میں اپنے، خدا، اب کوئی تاخیر ہے کس لیے — خم بہاں گردن، علم وہاں ہاتھ میں شمشیر ہے

ہے غزلخواں مثلِ بلبل کہتے ہیں وہ برگِ گل — پر ہمارے سامنے تو غنچہ تصویر ہے نواب[۵]

باغ میں بھی نفصلِ گل، زنداں میں ہے یہ گل کھلا — ہے گریباں ہاتھ میں اور پانو ہیں زنجیر کے
میں

اک ذرا سی اور بھی تاخیر کرنا، اے اجل — سنتے ہیں کچھ وہاں اپنے قتل کی تدبیر ہے
ہمارے

۴ قتل کرتے ہیں گمانِ داد خواہی پر ہمیں — دیکھ تو تقصیر سے پہلے یہاں تعذیر ہے
ہمنشیں

گزری اپنی عمر کس چین سے، شکر خدا — دیکھیے بنیاب اب کیا خواہشِ تقدیر ہے
گزری اب تک عمر اپنی

(۱۲۱/۲)

قبلہ، قصائد و غزلیات و رباعیات کو بقدر اپنی فہم و فراست کے درست کر کے خدمت میں گزرانتا ہوں۔ چونکہ جانتا ہوں کہ آپ اکبر آباد نہیں گئے، اِس لفافے کو آپ کے پاس رامپور کے پتے سے بھیجتا ہوں۔ توقع یہ کہ مجھ کو اپنا خادم سمجھیے اور جو خدمت میرے لائق ہو، بے تکلف ارشاد کیجیے۔ راقم اسداللہ خاں۔ مرقومۂ ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء

فرماتے ہیں بالیں پہ وہ بیمار کی اپنے — "کیا درد ہے؟ کیوں اس کا مداوا نہیں کرتے"
آکر

ہمیں کرنا تھا جو وہ کر بیٹھے — ~~اب تم ہم اٹھاؤ گھر بیٹھے~~
آپ باتیں بنائیں

اپنے ہاتھوں سے کر کے کام تمام — نوحے کرنے کو چارہ گر بیٹھے
نوحہ

حال بنیاب کا نہ پوچھو کچھ، — ہم تو اب آ کے صبر کر بیٹھے
چھو — اس سے

وفادار ناصح، مبارک ہوں غم کو — ہمیں تو وہی بے وفا چاہیے
تمھیں

مقابل میں تیرے تو اے پند گو | تجھی سا کوئی بے وفا چاہیے

گو

خدا نے دیا ہے عجب دل یہ ہم کو | اب ایسا ہی اک دلربا چاہیے

ہمیں

تصور تری زلف کا کیوں نہ ہوئے | شبِ غم نزولِ بلا چاہیے

بجا ہیں تمہارے سب ارشاد لیکن | ذرا اور کی بھی سنا چاہیے

پر

زباں پہ نام اُس کا دمبدم ناصح لوا تا ہے | خدا کے واسطے چپ رہ کلیجا منہ کو آتا ہے

سے

نیاز و ناز میں ہی ربط گر ضد ہی تو ظاہر ہیں | ~~ہیں پڑھتا ہوں درود اُس پر وہ صلواتیں سناتا ہے~~

درود اُس پر پڑھوں میں / اور

~~۲ خموشی سے مری ... کیا ...~~ | ~~کہے جا ناصحِ نادان مجھے یہ ذکر بھاتا ہے~~

شفیق

مطلع غنیمت ہے کہ نام اُس کا زباں پر تیری آتا ہے

کہے جا، ناصحِ مشفق! مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

کشادہ زلف کا دستِ عدو سے وہم آفت ہے | غش آیا جب ہوا نے نکہتِ مشکِ تتار آئی

بکھرنا

تسلی بخش ہو گی سادگی جو ان کی ای ... | ہیں جب یاد یہ آرایشِ روئے نگار آئی

کیا ہو

مل ~~گئے~~ خاک میں، لڑتے ہی تر سے | بن گئی جی پہ بگڑتے ہی ترے

ہم ملے

خدا کو تو پاتے ہیں عشقِ بتاں سے | ہیں ~~وصلِ صنم~~ مانگتا ہوں خدا سے

یہ میں ہوں کہ ...

اگر چشمِ بد ہے، تو کچھ زلف کم ہے؟ — یہ سچ ہے بچائے خدا ہر بلا سے

کیا

پاس رکھنے کا جو بیتاب ~~وہ وعدہ~~ کرے — صحبتِ غیر بھی واللہ گوارا ہو جائے

کریں وہ وعدہ — ناچار

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر نہ ہو — کچھ تم عقبیٰ میں تو ناصح رہے کام آنے سے

آپ

کیوں کیا جان ~~سے تنگ آ کر~~ دعا کی — نہ، منّت ہی کروائی خدا کی

کریں — مرگ کی آخر

ڈرانا تھا کہ اس کا دل دکھانا! — خدنگِ آہ نے ہے ہے اخطا کی

نہ

گئے وہ تو ہوا ہم کو بتا ~~کے~~[۲] — خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی

کر

۴ ~~عیادت سے بڑھی خواہش مرض کی~~ — ہمارے درد کی اچھی دوا کی

مرض کا ہو گیا شوق

~~نہ ہنسیے قیس کی دیوانگی پر~~ — ~~خبر تو لیجیے اپنے مبتلا کی~~

نہ دو لیلیٰ کو تم مجنوں کا طعنہ — جو دیکھو صورت اپنے مبتلا کی

~~زلف بکھری جو رخِ یار پہ یاں دل بکھرا~~ — ~~خود پریشاں ہوئے ہم اس کو پریشاں کر کے~~

، زلف خود بخود بکھرتی ہے۔ ہم نے کب پریشان کیا، جواب کہیں

اضطرابِ دلِ بیتاب، برا ہو تیرا — بد دماغ اس کو کیا نالہ و افغاں کر کے

بے

آہ، جس طرح موئے سب عاشق[۳] — وہی اپنی بھی حقیقت ہو گی

جس طرح آہ - طَرَح اور ہے اور طرح اور ہے۔ فقیر "طَرَح" بہ حرکت کے معنے میں طرح لیکن نہیں لکھتا۔

دیکھ ایمان سے کہدے واعظ		ایسی ہی حوروں کی صورت ہوگی

(اس غزل میں مقطع سے پہلے یہ شعر اضافہ کیا ہے)

بوسہ لیتے ہی پھر آجائے گی		جان، کیا بوسے کی قیمت ہوگی!

بیقراری سے موا، ہے ہے، کوئی اللہ سے		مانگ لائے ایک ذرا سا صبر اپنے نام سے[2]

حضرت ایوب گر جیتے ہوں، تو اے ہمدمو		ؤ		میرے

حشر میں اللہ کے آگے یونہی لے جاؤں گا		کام لینا ہے مجھے اپنے دلِ ناکام سے

مجھ سے یہ مصرع پڑھا نہیں گیا[3]

تو دیے جاگالیاں، دے لیں گے ہم بھی کچھ جواب

ہوش میں آئے کبھی گر لذتِ دشنام سے

آجائیں گے جب

تھا نہیں شوقِ طپیدن، پر ادب مانع ہوا[4]

بچ گئے ہم ذبح کے بھی وقت اس الزام سے		بہت

دیر دیکھا، میکدہ دیکھا، حرم بھی دیکھ لیں

آج آنکلے ہیں یہاں بھی گردشِ ایام سے[5]

ہم

ذکر اُسی کا ہے کچھ بھی فرمائے		کاش، ناصح ہی دل کو بہلائے

ہو

~~پھر بلا میں پھنسا دیا~~ کس نے؟		دی صدا نعش پر کہ وہ آئے

خوابِ خوش سے جگا دیا

جب اُن کا ہوا گلہ اُلٹا		کر کے شکوہ بھی اُن سے پچھتائے

اور		پچھتا

~~مارے خدا کہ چھوڑے~~، پہ ایمان کی توبہ ہے

~~اُلفت بتوں سے اپنے تئیں لا کلام ہے~~

"کو" کی جگہ "تئیں" نہ لکھا کرو

~~جبروت یہ نہیں ہے، نہ لاہوت نہ ابدا~~

یہ عشق ہے، کچھ اور ہی اس کا مقام ہے

لاہوت ہے نہ یہ جبروت ۱۲ اے خدا پرست = جبروت بحرکتِ موحدہ اور ملکوت

بحرکتِ لام صحیح ہے

~~پاکر نجات نزع سے آرام کرتے ہیں~~

سوتے ہیں بے خبر

ہم رہروِ فنا ہیں، یہ غربت کی شام ہے

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ

ص ساقی اگر نہیں تو نہو، مے سے کام ہے

بیتاب، پی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ

ص یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

(ان دونوں شعروں کے ہر مصرع پر صاد بنا کے دائیں گوشے میں لکھا ہے) واللہ! کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب (پھر بائیں گوشے میں لکھتے ہیں) خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزا میں ہی جانتا ہوں۔ غالب۔

ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کریں گے ~~آزاد تو بینے کو کبھی~~ یاد کریں گے

ہر روز کئی بار مجھے

پرواز کی ہے ~~گرچہ ہوس دل میں مگر ہم~~ آزردہ نہ ~~خاطر تیری~~ صیاد کریں گے

طاقت ابھی موجود ہے لیکن ہم خاطر

اسانی سے کیوں قتل کیا؟ حشر کو یہ تو اللہ سے ہاں، شکوۂ جلاد کریں گے

ہم

اس طرح مرینگے کہ ہو ہر ایک کو عبرت　　　معدوم ہم الفت ہی کی بنیاد کریں گے

دکھ سے

ستم کی حشر میں بھی باز پُرس کیا ہو گی؟　　　کسے مجالِ سخن اُس سے، ایخدا، ہو گی!

اُس سے

~~خدا کے آگے ہمیں پوچھے جائیں گے پہلے　　　میری وفورِ فضل الفت ہی دیتا ہو گی~~

"پوچھنا" اور ہے۔ پُرسیدن کا ترجمہ پوچھنا بے نون ہے۔ بے آگہی کے
واسطے لکھا ہے۔ شعر غلطیٔ املا کے واسطے نہیں کٹا، بلکہ ناقص تھا۔

~~فلک بہایگا آنکھوں کی راہ اُس کو بھی　　　جو خونِ دل ترے غم میں میری غذا ہو گی~~

خون مذکر۔ غذا البتہ مونث ہے۔ مگر زرا غور کیجیے، خون غذا ہو گا
یا خون غذا ہو گی!۔

نہیں ٹھہرا ہے اینٹک عرشِ اعظم　　　دعا کی تھی یہ کس نے بلبلا کے

ہے

بنِ اُس کے خونِ جگر ہم پئیں یہ مے، ساقی!

خدا کرے، تیرے ساغر میں بھلا لہو ہو جائے

کہ　　جام

(اس شعر پر صاد بنا کے حاشیے پر لکھا ہے) شعر اچھا، مگر بھی کا لفظ بے موقع
اور بے محل ہے۔

ہوئے ہیں گرچہ "ثاقب"، پر ہوا ابرِ باراں میں
ی

رہے ہے، ساقیا، میخانے میں تیار تھوڑی سی

میں سب سمجھے ہوئے ہوں، بات کا جو ڈھب تمھارا ہے

نہ جا ہوں، ناصحا، میں اُس کو، یہ مطلب تمھارا ہے

ناصحو

کہاں ہیں قیس اور فرہاد اب یہ عہد ہے اپنا

دور

کہاں ہیں لیلیٰ و شیریں، زمانہ اب تمھارا ہے

مژگاں کا تیری صید نہ کس طرح سے ہو دل

ہو کس طرح سے

اس تیر کے لیے یہی نخچیر چاہیے

نیکوں کے بھی جھکے رہیں سر کچھ تو، دیر کی

یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا!

مسجد کی چوب و خشت سے تعمیر چاہیے

بلا میں آپ پڑتا ہے تو ناصح — ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے

تو

خدا کیونکر ملائے دلربا سے؟ — نہ کہنے دو کہ یہ قدرت نہیں ہے

معاذ اللہ، مگر

یہی کہہ کہہ کے ملا حق شناس! — کرے جو چاہے، پر عادت نہیں ہے

بہلاتا ہوں دل کو

ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو — تمھارے آگے گو غیرت نہیں ہے

عزت

آج پیغامبر نہ کچھ کہتا — ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے

"وہ ہم پر بہت" جہاں پورا لفظ آسکے، یعنی پر، وہاں ادھورا لفظ کیوں لکھیے۔ البتہ جہاں گنجایش نہ ہو، وہاں قاعدے کے موافق جائز ہے۔ اور اس قاعدے کا نام تخفیف ہے۔

یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاب — تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

آپ

تیغ کھینچے ہوئے جس وقت وہ قاتل آئے
کوئی ہے میرے سوا، جو کہ مقابل آئے
کون

کیوں یک بیک زمانے کا نقشہ بدل گیا
یہ رنگ تو ہوا تھا نہ دنیا میں آشکار
ناگاہ کیوں

~~تزئین کچھ آج کل ہے وہ اس خاکدان کی~~
خلدِ بریں بھی رو برو ہے جس کے شرمسار
یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا!
ہو

گل نے کیا ہے شاخ کے ہر جز سے سر پڑ
اب کونسی جگہ ہے کہ نکلے جہاں سے خار!
جزو ظہور

بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزمِ نشاط میں
ہاں اک صبا تو پھرتی ہے گلشن میں بیقرار
نسیم

کثرت سے بسکہ جمع ہوئے شاہدانِ گل
کس کس مزے سے ہوئے ہیں آپس میں ہمکنار!
ہوتے ہیں

دن عید ہے زمانے میں اور رات شبِ برات
ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار
شب

وہ دن ہی آج، جس پہ کر دں جان تک نثار
ہے جشنِ غسلِ صحتِ نواب نامدار
فدا۔ اگر یہ مطلع ہے تو چاہیے اس سے پہلے ایک شعر میں اطلاع دیجائے

بیشک طمانچۂ ملک الموت گرز ہے
ہے تیغ اُس کی قہرِ خدا وقتِ کارزار
تپانچہ؟

ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی صفت
بیتاب، اب دعا ہی پہ بہتر ہے اختصار
ثنا

عالم کے حق میں آیتِ رحمت بنا دیا
رکھے سلامت اُس کو زمانے میں کردگار
آیۂ

بات یہ ہے وقت پر خوب سجا ہے مجھے
فکرِ رسا کا بڑا مجلہ یہ بھی احسان ہوا
سوجھا نطق

دھوم ہے سرکار میں جشن کا سامان ہوا — عرش سے بے فرش عیش کا طغیان ہوا

ہے — ہے آج

رنگ محل کا سماں ہو نہیں سکتا بیاں — جس کی نظر پڑ گئی ششدر و حیراں ہوا

دالہ

کثرتِ مُقیش سے مثلِ جبینِ عروس — روی زمیں پر عجب طرح کا افشاں ہوا

طرز

بزم منور ہوئی مقدمِ نواب سے — جب کہ وہ رونق فزا جوں مہِ کنعاں ہوا

جب سے کہ — وہ

جوں بمعنی مثل دانہ اب متروک ہے، اور چوں لفظِ فارسی الاصل تو آگے بھی متروک رہا ہے۔

دور میں اس کے بجز ابر نہ رویا کوئی — اور جز اس کے سوا کوئی نہ نالاں ہوا

بجز رعد کے

مسندِ اقبال پر یوں وہ نمایاں ہوا — صفحۂ گردوں پہ جوں مہر درخشاں ہوا

(میرزا صاحب نے اسے قلم زد کر کے یہ مطلع لکھا تھا)

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ قاآن ہوا — ویسا ہی اس قوم میں کلبِ علیخاں ہوا

(اس پر بیتاب نے لکھدیا ہے "قصیدۂ ہذا در شانِ یوسف علی خان بہادر مرحوم بود، ازیں سبب شعر ہذا نوشتنی نیست)

ہو رہی ہے عجب آراستگی کہنہ سرا — سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوئے ہیں مامور

دنیا کی

نکڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبریل — ایک طرف ہاتھ میں لے کھڑے ہیں سرافیل بھی صور

ہے

قبضِ ارواح سے معذور ہوئے عزرائیل — موت کا غم ہی کسی کو نہیں سب ہیں مسرور

کی فکر

زیبِ زینت کا اساس دہر میں کیا کہنا ہے — صانعِ گل کی یہ تعلیم، ملائک کا شعور
کی — تو

چاندنی رات کا ~~تو ذکر ہی کیا اصلِ علی~~ — لیلۃ القدر یہ قانون ہے شبِ تار کا نور
کیا ذکر ہے! اللہ اللہ

کو بکو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کہ دیں کس کو زکات — تھے جو محتاج جہاں میں وہ سبھی ہیں غنی تقدر
وہ ایسے ہوئے

کوئی دعوت سے مسافر بھی نہ محروم رہا — بادشاہوں ~~کے یہاں بھی~~ نہ تھا یہ دستور
اہلِ جہاں کا بھی

اس قدر کھانے کی افراط ہے اور پانی کا قحط — دیکھو جس جاہ کو، ~~شربت سے~~ ہی منہ تک معمور
ہے بھرے

کس سلیقے سے ہے آراستگی ہر بھرتی کی — مہتمِ بزم کے آج اپنا دکھانے ہیں شعور
تھاپ طبلوں کی بجتی ہے فلک پر پیہم — بھر سارنگیوں کے سُر کے ملک ہیں مسرور
ے

حشر تک کان سے نکلے گی نہ نغمے کی صدا — یہ خیال آئے گا اک تان ہے شورِ نشور
ئے — بس[3]

تھاپ طبلوں پہ پڑی، آئے ~~پری~~ کے چھم گٹ — شادیانے کی صدا پہنچی فلک سے بھی دور
پریوں کے آئے تھگٹ

گھونگرو کے وہ چھماکے وہ صدا نغمے کی — اہلِ محفل کو کیا عشوہ گردوں نے مسرور
گھونگروں[4]

~~چلی اس طرح سواری کہ نہ دیکھی نہ سنی~~ — ~~رشک سے کھانے لگے غم ... امیر طیمور~~

یہ لفظ "طوہی" سے نہیں، "رستے سے ہے۔ اور پھر تیمور بوزنِ طنبور نہیں، دراصل "تمر" بوزنِ سمر ہے۔ لکھتے ہیں تیمور اور پڑھتے ہیں تمر اور تمر ترکی میں فولاد کو کہتے ہیں۔

شُتری و فیلی و ماہے ہیں، نفیر و نوبت — دف دنے، تاشہ، دہل، جھانجھ، نرم ہے طنبور

لنگیں تاش تمامی کی ہیں باندھے سقّے — ہیں ہزارے جڑے اور عطر سے مشکیں معمور

لنگیاں

کرد ایں فخر قصائد چو رقم خامۂ من

وجد کردند چہ خاقانی و عرفی در گور

جائز قصیدۂ ہندی شعر فارسی، خصوصاً وقتے کہ لفظ گور قافیہ باشد

مناسب نیست۔

للہ الحمد کہ اب چرخ ہوا نیک خصال — ترک اس نے کئے سب اپنے ذمیمی افعال

سے وہ

راہ میں ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے لعل و گہر — خذف و سنگ سے بے قدر ہیں دینار و ریال

خزف بمعنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اس کی ز سے ہے۔

ناچ گانے ہی کی ہر سمت سے آتی ہے صدا — منحصر ہی بادہی اب برج ہے اگر ہے جبال

بھی

ہے کسی جا پہ بھگت، رس کہیں سانگ کہیں — کہیں کنجن کہیں کنچنک ہیں کہیں ہیں تو ال

رہس

کوئی اعنت کبھی تو ایسا ہی قوی ہے ورنہ — اس کی عادت سے تو یہ بات تھی بس کہ محال

البتہ

سب اپنے اسرار سے واقف ہے تو لی[۲] اہلِ فن — سمجھ نیرے کوئی پہچانے یہ ہے کس کی مجال

یہ کس کی

اگاہ

بن پڑے صانع قدرت سے کہیں دو ایک نقشے — کھینچنا اور بھی کچھ سکیتیں گر ایسی انسکال

کچھ[۳]

یہی نقشے

دیکھ کر اس کی عبارت کو ظہوری کا ہے رنگ — لکھیے ایسا، نہیں یا قوت رقم حال کی مجال

بھی

اور شجاعت کا یہ عالم ہے کہ زہرہ ہو آب — دیکھ لیں حضرت رستم اگر اس کی تمثال

سے رستم دستاں

ہو بہ حیرت، میں نہیں تھا کہ زمیں پر اٹھو — عرش کی سیر کا راکب کو گر آجائے خیال

کہ میں یہاں — یا رب

~~وعدہ کیا تھا وفا کا جز لاینفک~~ — ~~عہد کا نقض ہو عہد میں دن کے بعد ال~~

جز لاینفک ملا، جزو لاینفک صحیح۔

بھوکے پیاسوں کے خور و نوش کے کیوں تھے نہ دن
یہ مسلّم ہے کہ بعد رمضاں ہے شوال ا

ار

فلک پر کوئی اڑ جائے، بسدہ ری — نصیبوں میں سواد دگر زمیں ہے

یہ آخر

یہ پیچ ہے تحسین کے قابل ہیں معشوق — مگر عشاق میں بھی آفریں ہے

کو

جنابِ غالب ~~دو دل~~ کا بیتاب — خلوص ہے طبع سے اب تو سند جبیں ہے

کلامِ حسرت، غالبِ دوراں عفا اللہ عنہ

اے دل تو اس کو دیکھ کے ایسا پھسل گیا — حیران ہوں میں کہ پہلو سے کیونکر نکل گیا

سے

دل پر بنی ہوئی تھی اجل کے نہ آنے سے — اس سماں پہ آئی تو ذرا دل سنبھل گیا

تو

کیسا مزا دکھاتے ہیں ہم بھی، تو ٹھہر جا — نقرہ بہ بس کرکے روز یہ، اے صبح، تو ٹل گیا

شعر تو

پہچانتے ہے وہ تیزاب کا کیوں میرے جوہر تم — ہم سے دلِ بر داغ پہ رکھا ہے جو مرہم

سیہ

وہ بات کر دِجیے نہوں نالہ و افغاں — بیچین ادھر رہتے ہو تم اور ادھر ہم

جس سے

کہوں کیا، وہ یوں جتانے کی نہیں ہے — رقیبوں کے سنانے کی نہیں ہے

وہ بات ایسی چھپالے — بہ غیروں ا

نہیں سچ باور آنے کی نہیں ہے — پہ الفت بھی دکھانے کی نہیں ہے

رکر مجھ سے کرے میری بلائیں — مری

وہاں رقیبوں سے گرم صحبت، یہاں امید وفای وعدہ

ہے ایک طرفہ یہ تماشا، تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش

بہ طرفہ تر

محبت تری، اسکی نفرت بڑھی — یہ کیسا پڑا اب دل زار بیچ

اُن سے ہو ترا پیار، خدا کی قدرت — مسرور ہوں اغیار، خدا کی قدرت!

ہم شکل گنہ گار، خدا کی قدرت — اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ظالم

مثل — جھکے

دنیا کا یہ کارخانہ ہے مثل سراب — غافل نہ کر اپنی زندگی کو تو خراب

زندگانی

مرچکے ہم تو، نہ غیروں کی بھی بنیاد رہے — یا الٰہی، یونہی وہ برسرِ بیداد رہے

مٹ گئے

بلبلو، کوچ کریں، باغ میں صیاد رہے — گریونہی ٹھہری کہ گلزار نہ آباد رہے

بلبلیں

کیوں تری فصد سے حیرت میں نہ فصاد رہے — ضعف میں رگ تو کہاں، ہاتھ نہیں ہاتھ آیا!

نصاد — فصد

اسکی مظلومیں پہ رحم آئے نہ کیونکر بیتاب — قتل کے بعد بھی خوش بیٹھے نہ جلاد رہے

کے مقتولوں — جس سے

نہیں تلوار کے تننے کی بھی اب کچھ حاجت — تیرے ابرو کے اشارہ نے مارا قاتل

ہی سے

دیکھنے کو جو ہم عشاق کی محفل آئے — سب پکار اٹھے کہ لو مرشد کامل آئے

ہم ہو کل دیکھیے "جو ہم عشاق" میں علن تقلیل سے گر جاتا ہے۔

ہوں وہ میکش جو کہیں ہوس ہو دو عزم کروں — میکدہ لینے کو میرے کئی منزل آئے

کبھی

بدنصیبوں کی نصیب وصل کی خوبی دیکھو — کہ وہ آئے بھی تو اغیار کے شامل آئے

تب

پہلی تیرے سوا ~~کہتے~~ کس سے وہ فریاد کرے — جب کہ بیتاب پہ مولا کوئی مشکل آئے

"بمطالعہ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ مفتوح باد"

[منشی سیلچند راجہ کنور سین کی اولاد ہیں کنور سین قوم کے کایستھ اور نواب سید علی محمد خاں بہادر فاتح روہیلکھنڈ کے معتمد سردار تھے قلعہ سرہند کی فتح میں اپنے ولی نعمت کے ہمرکاب خدمات شائستہ انجام دے کر بادشاہ دہلی کے دربار سے راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ روہیلہ سلطنت کے ٹکڑے ہوئے اور نواب سید فیض اللہ خاں بہادر ریاست رامپور کے والی بنکر اس خطے میں تشریف لائے تو ان کے ہمرکاب تمام وفادار سرداران روہیلہ کے ساتھ منشی صاحب کا خاندان بھی تھا۔ منشی سیلچند کی تاریخ ولادت اور جائے پیدائش کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ء کو ان کی عمر اکیاسی سال کی تھی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۸۱۳ء قرار پاتا ہے۔ ان کا ابتدائی تقرر نواب سید احمد علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں بعہدہ ناظر نظامت ہوا بعد ازاں عامل (تحصیلدار) مقرر ہوئے ۱۸۴۴ء میں ان کے والد نے وفات پائی، تو ان کی اسامی پر محکمہ دار الانشاء میں بدل دیئے گئے غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے خبر رسانی و فراہمی رسد وغیرہ کا کام انجام دیا، اور نواب گورنر جنرل بہادر سے بصلۂ خدمات دربار فتح گڑھ میں دوشالہ انعام میں پایا۔ نواب فردوس مکان نے بھی ان کی خدمات کی تعریف میں روبکار جاری فرمایا اور تلوار عطا کی نواب صاحب کی وفات کے بعد خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں نے بھی ان کی بہت قدر و منزلت فرمائی۔ بالآخر پانچ والیان ریاست کی خدمت کرکے ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ء کو ۸۱ سال کی عمر میں رامپور میں انتقال کیا۔

منشی سیلچند کو فارسی میں دستگاہ کامل حاصل تھی اور ملا غیاث الدین رامپوری مولف غیاث اللغات سے شرف تلمذ تھا۔ شعر بھی کہتے اور منشی تخلص کرتے تھے!

۱۲۲

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد دعای دوام حیات و ترقیٔ درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روی خطوط حضور صحت و عافیتِ حضور معلوم ہوئی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سنا کہ غسلِ صحت کیا، یا کس دن کریں گے؟ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھ کو لکھیے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں، تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔

خیر و عافیت کا طالب، غالب ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۴ء

۱۲۳

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں، منشی سیلچند صاحب میر منشی کو خدا سلامت رکھے۔!

مادۂ تاریخ غسلِ صحت کو تم نے غور نہیں کیا ۱۸۶۶ عدد ہوتے ہیں پھر کیا حضور سال آئندہ غسلِ صحت فرمائیں گے؟ یہ تو جنوری سال ۱۸۶۵ ہے۔ اس تاریخ کا قطعہ کیونکر لکھوں؟

یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیر الدین صاحب رامپور سے آئے، اور انہوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعے کے دن ساتویں تاریخ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ ماہِ آیندہ یعنی رجب میں نہائیں گے۔ خیر، وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزرے گا۔ اگر موقع پاؤ، تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایت شاہ کبیر الدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے۔ غالب

۱۹ر جنوری سنہ ۱۸۶۵

۱۲۴

منشی صاحب، عجب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاج مبارک کا

حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے، خدا کے واسطے تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے؟ دربار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟ سوار ہوتے ہیں یا نہیں؟

زین العابدین خاں نے جیپور سے اپنے اشعار اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجے۔ میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا، اور اشعار مسترد کر دیئے ان کا خط اور اس کی پشت پر اس کے جواب کا مسودہ اس خط میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لو، بلکہ اگر موقع اور محل پاؤ، تو حضور کو بھی پڑھوا دو والدعا

اسد اللہ خاں غالب ۱۴، مارچ سنہ ۱۸۶۵

۱۲۵

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں منشی سیلچند صاحب میر منشی کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ یہ خط[2] میں نے ایک سنبار روز کی فکر میں حضور کو لکھا ہے مگر مسودہ جو ہر بار کچھ کا کچھ ہوتا رہا، اس سبب سے میرے پاس نہیں رہا اور خدا کی قسم، کہ میں اب بہت ناتواں ہو گیا ہوں؛ یہ خط لیٹے لیٹے صاف کیا ہے اور اس تحریر کو مجموعۂ نثر میں رکھا چاہتا ہوں۔ آپ اسکی نقل کر کے مفر[3] مجھ کو بھیجدیجئے گا۔ بڑا احسان مجھ پر ہوگا[4]۔ اسد اللہ فقط

۱۲۶

منشی صاحب سعادت و اقبال[5] نشاں منشی سیلچند صاحب، طال عمرہٗ!

تین صاحبوں نے اطراف و جوانب سے تین قصیدے میرے پاس بھیجے ہیں حیران ہوں کہ کیا کروں! اگر حضور میں نہ گزرانوں اور ان کو لکھوں کہ میں نے گزران دیئے، تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ گزرانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، ادب رخصت نہیں دیتا۔ ناچار وہ تینوں قصیدے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ یہی اُن صاحبوں کو لکھوں گا کہ میں نے میر منشی کو حوالے کر دیئے[5]۔ فقط

سید فرزند احمد بلگرامی صفیر تخلص۔ یہ سید نورالحسن خاں بلگرامی کا پوتا اور صاحب عالم، پیرزادۂ مارہرہ، کا نواسا ہے[1]

حالی تخلص، مولوی الطاف حسین، پانی پت کے رئیس، عالم، شاعر نواب مصطفیٰ خاں کے رفیق۔ قصیدہ عربی[2]

تیسرے قصیدے کے خاتمے پر شاعر کا نام و نشان مرقوم[3]

۱۲۷

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں، عزیز تر از جان، منشی سیلچند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے[4]۔ کیوں صاحب، ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں، اور تمہارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے۔ خط لکھنا تم نے یکقلم موقوف کر دیا۔ اور بھائی بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے، نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں آج کے نواب صاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہوئیں مجھ سے: لکھنا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے، کہ آج بچا کل مرا، کل بچا پرسوں مرا۔

اس خط کا جواب[5]، مجھ کو جلد لکھو، اور اس میں یہ لکھو کہ احسن حسین خاں اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ سے آئے ہیں[6] نواب صاحب کی سرکار سے ان کا کیا درماہہ مقرر ہوا ہے، اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے، دربار میں جو آتے ہیں، تو بیٹھتے کہاں ہیں[7]؟

اس خط کے جواب کا طالب، غالب۔ ۱۱ جون[8]

۱۲۸

برخوردار، نور چشم، منشی سیلچند ہیر منشی کو بعد دعا کے یہ معلوم ہو کہ اگلے مہینے یعنی اگست سنہ ۱۸۶۸ء کی[9]، تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی، اس نے دیہ ابتک نہیں پٹا ہے۔ جس دن ہنڈوی آتی ہے،

اُسی دن یا دوسرے دن اپنے مختارکار کے ہاتھ، کہ وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اُس مختارکار کو، جس کے ہاں ہنڈوی آئی ہے، اُس نے روپیہ ابتک نہیں دیا۔ ۸ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچ کر روپیہ میں نے لے لیا تھا، اور آج ۱۸ ہے۔ مختارکار کو روپیہ اُس نے ابتک نہیں دیا۔ جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے، اُس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے، تاکہ مختارکار کا روپیہ پٹ جاوے۔

(مہر: غالب ۱۲۷۰) [۲]

یہ تینوں آدمی اُس کی دھجیاں اُڑا ڈالتے، حال آنکہ فیضی و ابوالفضل اُس کے دشمن تھے۔ پس جب ان دونوں نے باوجودِ عداوت اعتراض نہ کیا، تو اب عرفی پر کون اعتراض کر سکتا ہے؟ عرفی کی زبان سے جو نکل جائے، وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے، اور ہم اُس کے مقلد اور مطیع ہیں۔ غالب

بنام مولوی محمد حسین خاں مالک مطبع

[مولوی محمد حسین خاں، ابنِ مولوی محمد حسن خاں، ابنِ شاہ محمد خاں مہمند افغان رامپور کے ایک شریف و باعزت خاندان کے فرد تھے۔ ان کے پردادا، نواب سید محمد فیض اللہ خاں بہادر کے ہمراہ افغانستان سے تشریف لائے اور فوج میں بعہدۂ جمعداری مقرر ہوئے۔ مولوی محمد حسن خاں نے تیغ نیاگاں کو قلم سے تبدیل کر لیا، اور اُس زمانے کی مروج تعلیم حاصل کرکے نواب فردوس مکاں کے حسبِ ایما سنہ ۱۸۵۶ء میں مطبعِ حسنی قائم کیا۔ بعد ازاں نواب خلد آشیاں کے حسب الحکم ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۸۳ (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) کو اخبارِ دبدبۂ سکندری کا پہلا پرچہ شائع کیا۔ مولوی محمد حسن خاں نے مولوی محمد حسین خاں کو اپنی زندگی ہی میں مطبع کا مہتمم اور اخبارِ دبدبۂ سکندری کا مدیر بنا دیا تھا۔ منگل کے دن ۲۹ شعبان ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا، تو چند سال تک ان کے چھوٹے بھائی مولانا شاہ فاروق حسن خاں صاحب صابری، رحمہ اللہ نے اپنے مشاغلِ طریقت کے ساتھ دبدبۂ سکندری کو بھی مرتب کیا کچھ مدت بعد سے فرائضِ ادارت اُن کے فرزندِ اکبر مولانا فضلِ حسن خاں صابری انجام دے رہے ہیں۔ مؤخر الذکر بزرگ نے اپنے گرامی نامۂ موسومۂ عرشی میں تحریر فرمایا ہے: "اخبار دبدبۂ سکندری کی ہندوستان بھر کے اخبارات میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ۷۴ سال کی مدتِ مدید میں برٹش گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ نے کبھی اس کے ایک حرف پر نہ کوئی اعتراض کیا، نہ اس سے کبھی ضمانت طلب ہوئی، نہ اس پر کسی نے آج تک کوئی مقدمہ چلایا۔" دبدبۂ سکندری، ج ۷۴، نمبر ۳۵، ۱۳، مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۴۰ء]

۱۳۰/۱

مشفقی اور مکرمی محمد حسین خاں صاحب کو غالب آزردہ دل کا سلام پہنچے
آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھیرے، کئی خط آپ کے پھیرے
اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا، یا کوئی جھوٹ کی
پوٹ۔ بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ، اور جو کچھ سمجھ میں آیا، وہ غلط اور دروغ
اور جھوٹ۔ یہ غلطِ محض ہے کہ مطبع[1] حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو حضور کی طرف
سے۔ اللہ۔ اللہ! دُبیجے سنگھ[2] کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک
ورق سیاہ کرتے ہو، اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے پادشاہ، یعنی امیر المسلمین
نواب کلب علی خاں بہادر کے نام رکے[3] آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ
تعظیم کے لکھتے ہو بس، اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف
سے ہے، تو گویا دُبیجے سنگھ[2] کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہو گی۔ ہندوستانی
عملداری[4] میں وہ ایک زمیندار اور مالگذار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اُس کو جاگیردار
مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں، رئیسِ ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ
لکھتے ہو۔[5] اس سے معلوم ہوا کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں
سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی، "یک در گیر و محکم گیر"۔ اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو
تم، تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا ہے کہ اپنے پادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو،
کبھی صفحے پر کبھی حاشیے پر؟ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف
کیا ہے، اور اب پھر تمہیں لکھتے ہیں کہ دوہائی خدا کی! میں یکم جنوری سنہ ۱۸۶۸ء
سے دبدبۂ سکندری کا خریدار نہیں ہوں! نہ بھیجا کرو، واسطے خدا کے، نہ بھیجا
کرو! اس سے زیادہ کیا لکھوں!

(مہر: غالب، ۱۲۷۸)[6] (۲۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ء)

تمّ بالخیر۔ والحمد للہ اوّلاً و آخراً

حواشی

صفحہ ۱

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے۔

صفحہ ۳

(۱) میرزا صاحب کے اس قطعۂ تاریخ کا پتا نہیں چلا۔

(۲) مولانا فضلِ حق، مولانا فضلِ امام صاحب کے صاحبزادے اور خیرآباد کے رہنے والے تھے سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۲ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو انڈمان میں وفات پائی۔ موصوف نے علومِ عقلیہ و نقلیہ اپنے والدِ ماجد سے اور حدیث مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھی تھی۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

"فنونِ حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، خلیق و ذلیق، انتہا کے صاحبِ تدقیق و تحقیق،... جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے ذی اقتدار و صاحبِ اختیار تھے۔ جھجھر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدر الصدور تھے، اور اس دارالریاست (رامپور) میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے۔ جنابِ مستطاب نواب فردوس مکاں کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے، اور بندگانِ حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے تشریف لے گئے"۔ (انتخابِ یادگار: ۲۹۱)

مولانا کی تصانیف یہ ہیں: (۱) مجموعۂ قصائدِ عربی (۲) رسالۂ غدریہ (۳) رسالہ امتناع النظیر (۴) ہدیہ سعدیہ۔ آخری کتاب نواب سید محمد سعید خاں بہادر کے نام پر نواب فردوس مکاں کے لیے لکھی گئی تھی۔ میرزا غالب ان کے مخلص دوست اور معتقدِ خاص تھے۔ مولانا نے سررشتہ داری عدالتِ دہلی سے استعفا دیا اور نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر جھجھر تشریف لے جانے لگے، تو اہلِ دہلی کو بیحد قلق ہوا۔ میرزا صاحب مولوی سراج الدین احمد کے نام خط میں مولانا کی علمی منزلت کے متعلق تحریر کرتے ہیں: "ہفتہ مباد کہ بے تمیزی و قدرناشناسیِ حکام رنگِ آن ریخت کہ فاضلِ بے نظیر و المعی یگانہ، مولوی حافظ محمد فضل حق، از سررشتہ داری

عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وارہانند۔ حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و بینش مولوی فضلِ حق آن مایہ بکاہند کہ از صد یک ادا مانند، و باز آن پایہ را با سررشتہ داری عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز این عہدہ دونِ مرتبۂ وی خواہد بود۔" (کلیاتِ نثر: ۱۴۷)

(۳) اس عریضے میں میرزا صاحب نے جس سابق تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے وہ رشتۂ استادی تھا۔ نواب فردوس مکاں، اپنے والد ماجد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان کے چچا نواب سید عبداللہ خاں بہادر، صدر الصدور میرٹھ، اور نواب سید عبدالرحمن خاں بہادر میرزا صاحب کے محبِ خاص تھے۔ غالباً انھیں دونوں کے حسبِ تجویز، نواب صاحب نے میرزا صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی۔

اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۵ فروری سنہ ۵۷ء کو ارقام فرمایا: "منیقۂ ایقۂ بلاغت آگین مشعرِ رسیدِ خطِ مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارتِ رنگین و دقیق در عینِ انتظار سرمہ کشِ عیونِ وصولِ نشاط مشمول گردیدہ، با طلاع خیریت مآثر مایۂ سرورِ نا محصور افزودہ، از مزید شفقت و ائتلافِ قلبی مشعور شد۔ مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیتِ یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن محض بجہتِ سامعیتِ کلامِ سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں سبیلی بازین نظم نرسید لہذا چند ابیات واہیات موزون نمودہ، بغرضِ اصلاح پیش آن یگانۂ آفاق مرسل گشت، چشم داشت کہ بعد اصلاح، غزلہای مذکورہ مع کدام طرحِ جدید لطف فرمودہ شوند۔ از انجا کہ اتحاف شیرینی ہم درین خصوص از دستور الست، لہذا ہنڈوی مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ بتقریبِ شیرینی لف رقیمۂ الوداد ہذا میرسد، بمقتضای الطاف منظور فرمودہ از رسیدن آن مطلع فرمایند و مخلص را لیل و نہار متمنی اخبارِ اخبار تصور فرمودہ، اکثر با یصالِ نمائق انائق خبریت و ثائق بعبارتِ سلیس، کہ در خواندنش تاملی بوقوع نیاید، مسرور و ممکن میفرمودہ باشند۔"

صفحہ ۵

(۱) اس قصیدے کے لفافے پر میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "قصیدۂ ہانا اگر گوہر جان فرستم بتاریخ ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ بمواجہۂ میرزا نوشہ صاحب بحضور پر نور گذرانیدہ شد۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے قیام رامپور کے زمانے میں نواب صاحب نے قصیدہ دار الانشا سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ چونکہ اس کا شامل ہونا تحقیق تھا، اس لئے کلیاتِ فارسی (ص ۳۲۵) سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ قصیدے کے متعلق نواب صاحب کی رائے چوتھے عریضے کے حاشیے میں درج ہوگی۔ پتے کے نیچے میرزا صاحب نے لکھا ہے:
"از غالب مکرنگ، بیرنگ (ازرو) احتیاط، چہارشنبہ، یازدہم فروری سنہ ۱۸۵۷ء"
روانگی قصیدہ کی یہی تاریخ تیسرے عریضے میں بھی مذکور ہے۔

(۲) مولانا فضل حق خیرآبادی مراد ہیں۔

(۳) ڈاک خانے کے اس نئے بندوبست سے میرزا صاحب کا مطلب وہ نیا انتظام ہے جو لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں عمل میں آیا تھا۔ ہر نئے انتظام کے وقت کچھ دشواریاں ضرور پیدا ہوتی ہیں، بعید نہیں کہ اس نظم سے بھی لوگوں کو شروع شروع میں مراسلتی دقت اٹھانا پڑی ہو۔

(۴) اس سے وہ قصیدہ مراد ہے، جو ابھی نمبر ۴ پر گزر چکا ہے۔

(۵) سفتجہ ہنڈی کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ فارسی کا لفظ سفتہ ہے، جس کے آخر میں تصغیر کے لیے چہ بڑھائی گئی ہے۔ عربی میں سفتہ کو سفتج کہتے ہیں۔

صفحہ ۶

(۱) یہ پرانا محاورہ خود میرزا صاحب کے صرف چند خطوں میں نظر آتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں فصحائے دہلی اس سے بچنے لگے تھے۔

(۲) یہاں پر ''اس'' کی جگہ 'ان' ہونا چاہیے، اس لئے کہ اوپر مسودوں کا ذکر ہے۔ غالباً میرزا صاحب کے ذہن میں لفافہ آگیا جس کا ابھی ذکر ہوا ہے اس کے خیال سے جمع کی جگہ واحد ضمیر استعمال کر گئے۔

(۳) ڈ نقط کی طغرائی شکل ہے۔ اکثر پیر گرات کے خاتمے یا پورے مضمون کے خاتمے پر بنائی جاتی تھی۔ میرزا صاحب نے بھی جگہ جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ میں نے سہولت قرأت کے خیال سے [illegible]

(۴) تیسرے اور چوتھے عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۳ رجب سنہ ۱۲۷۳ ہجری یکم مارچ سنہ ۱۸۵۷ء کو تحریر فرمایا'' ..... دو قطعۂ صحیفۂ ... مشعر ترسیل قصیدہ مضمون استطلاع وہم در جواب رفتہ، لوداد و رسید اشعار و سفتجہ مرسلۂ انجا، و ثانی مع اشعار مذکور بعد نظر اصلاح و تجویز چند الفاظ جہت تخلص مخلص باہمی پسند از آنجملہ مضامین برجستہ و عبارات دلبند متواتر بسبیل ڈاک گلگونہ آرائی چہرۂ وصول فرحت مشمول گردیدہ و مطالعہ قصیدہ نادرۂ فصاحت نصیب کہ اگر ہر شعر تنزش را گنجینۂ معانی و معدن لآلی سحر البیانی خوانند بجا، و یا گلدستۂ برجستہ چمنستان علوم و کمال نامند زیبا، غواص فکر در بحر زخار استعارات و نکات مبینش مستغرق گرداب نارسائی، و اوہام عقلای زمان بدر یافت خوبی و لطائف آن خزینۂ اسرار معرفت کوتاہی، قصائد عرفی و خاقانی بمقابلۂ متانت و برجستگی مضامین نزہت آگینش ہیچ، و معانی مبین فزین در الفاظ نادرش چون زلف ماہ رویان پیچ در پیچ، الواب افادہ و انشراح بی اندازہ بر روی دل صفا منزل کشود و زنگ کثافت طبعی از صیقل خواطر مستفادات زدود۔ و غزلیات کہ بنظر اصلاح: آمین کہ بیارس آشنا شد۔ فی الفور بصورت طلا مند فائز گشتہ لطف شد مند، مخلص صمیم مشکور الطاف و بذل توجہات سیاب آں مستعنی الصفات گردید العظمۃ للہ! تغیر و تبدل الفاظ نادرہ در اشعار مذکور چون نقش بر نگیں رہ بنیاد گرفت و طلای طبع خام بر محک فیض عام جلوہ پذیرفت . ومحملۂ الفاظ تخلص لفظ ''ناظم'' مطبوع طبع نیاز گشت ...''

(۵) اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۲۵ رجب سنہ ۱۲۷۳ھ، ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۵۷ء کو تحریر فرمایا: صحیفۂ مسرت آگیں .. مشعر رسید رقیمۃ الوداد و ادراکہ معنی الفنا شرائف عبارت اردو و بعد ملاحظہ چاک شدہ باستند۔ . و وصول نشاط مشمول گردیدہ مستفسار الارقام سامی صحیفۂ موصوفہ لیں استماع نضمونش چاک نمودہ شد۔ و آئندہ ہم در بارۂ مجموعہ مکاتیب تعمیل ایمای سامی ملحوظ خواہد ماند'' اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کی یہ خط و کتابت بصیغۂ راز تھی، ورنہ ۱۵ فروری سنہ ۱۸۵۷ء کا خط تھا۔ ... دہلی میں تھا اس کے

چاک کرنے کی ہدایت کیوں نہ کی؟ اور کی تھی، تو یہاں تعمیل کیوں نہ ہوئی! واللہ اعلم

صفحہ ۷

(۱) یہاں بھی "اس" کی جگہ "ان" ہونا چاہیے، کیونکہ غزلوں کے بھیجنے کا ذکر ہو رہا ہے، غزل کا نہیں۔ شاید لکھتے وقت میرزا صاحب کے خیال میں غزلوں کی جگہ خط آ گیا تھا۔

(۲) نواب فردوس مکاں نے اس عریضے کے جواب میں ۴ رمضان سنہ ۳، ھ (۹ مئی سنہ ۵۷ء) کو تحریر فرمایا:.... منشفقا! ایں مرتبہ کہ توقف در تسطیر رقیمۃ الاخلاص بظہور آمدہ، باعث آں عدم فرصتی تصور تواں فرمود۔ حالا کہ فرصت دست داد، ترقیم مافی الضمیر اتفاق افتادہ

(۳) اصل میں "پہونچا" ہے لیکن یہ سہو قلم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اسی سطر میں یہ لفظ میرزا صاحب نے درست لکھا ہے۔

(۴) میرزا صاحب تلفظ کے اتباع میں "جھکو"، بحذف ہائے مخلوط لکھا کرتے ہیں۔ ان کے دیوانِ اردو کے اس نسخے میں بھی جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے، مجکو اور مجھے تحریر ہے۔ مگر میں نے صحیح املے کو ترجیح دیتے ہوئے ہر جگہ مجھ کو بنا دیا ہے۔

(۵) میرزا صاحب کے دیوانِ اردو کا یہ نسخہ کتاب خانے میں موجود ہے ناپ ۱۱½ × ۷¾، اوراق ۲۳، اور فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں۔ خط صاف اور روشن نستعلیق اور ابتدائی دو صفحے طلاکاری، ہر غزل کے خاتمہ پر رنگین بیل بوٹے اور تمام صفحات کی جدولیں رنگ آمیز ہیں۔ آخر میں آبرکی تقریظ ہے۔ اس نسخہ دیوان کے متعلق میرزا صاحب نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے: اب تم سنو۔ دیوانِ ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں، میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا، اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا، نوبھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھکو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لیکر کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بیسبل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔" (اردوی: ۳۸۱) بعد ازاں ۳ جولائی سنہ ۶۰ء کو اس کے مکمل ہونے کے بارے میں لکھا ہے: "میاں تمہاری باول برتنی آئی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے وہ اور کونسی دو چار غزلیں ہیں جو میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں، اور اس دیوان میں نہیں؟ اس طرف سے اب اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں ہے۔ معہذا آں سے بھی کہوں گا اور وہ غزلیں ان سے منگا کر دیکھوں گا۔" (العقا۔ ۳۸۴) اس نقل سے منشی شیو نرائن نے اپنے مطبع واقع شہر آگرہ میں دیوان کی طباعت کا انتظام کیا تو اس کے متعلق میرزا صاحب نے علائی کو لکھا: "اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں، اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔" (العقا۔ ۴۲۹) لیکن شیو نرائن نے طباعت میں تاخیر کی، تو میرزا صاحب نے آغاز ۱۲۷۸ھ (جولائی ۱۸۶۱ء) میں اسی کے نسخے سے مطبع احمدی، دہلی میں دیوان طبع کرا لیا۔ بعد ازاں آخر سنہ مذکور (مئی سنہ ۶۲ء) میں چند اشعار کے اضافے کے ساتھ اس کی مصحح نقل مطبع نظامی کانپور میں چھپوا کر شائع کی۔ شیو نرائن کا نسخہ سپرد دری کی تاریخ کے مطابق سنہ ۶۳ء میں لکھا جانا شروع ہوا، اور غالباً اسی سال میں چھپ بھی گیا۔ ...... نہ کرنے، تو نسخۂ رامپور کو

دیوانِ غالب مطبوعہ کی اصل بننے کا شرف حاصل ہوتا۔ تاہم دیوانِ غالب کے جس قدر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، وہ سب کے سب، اپنی تکمیل میں نسخۂ رامپور کے رہینِ منت ہیں۔

(۶) یہاں معناً لفظ "کے" ساقط معلوم ہوتا تھا، اس لئے اضافہ کر دیا گیا ہے۔

صفحہ ۸

(۱) میرزا صاحب نے "اُس" کی جگہ "اِس" لکھا ہے۔ چونکہ اسی جملے کے بعد رامپوری ساہوکار کے لئے اشارۂ بعید استعمال کیا ہے، اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس جگہ ازراہِ سہو "اُس" کی بجائے "اِس" لکھ دیا ہے۔

(۲) یہاں سے آگے کے الفاظ حاشیے پر ہیں، اور حوالے کے لئے (۱۵) کا ہندسہ متن کی عبارت کے خاتمے اور حاشیہ کی عبارت کے آغاز میں لکھا ہے۔

(۳) دردس مکاں کے محولہ بالا فرمان کی نقل مثل میں شامل ہے۔ اس میں سے قابلِ مطالعہ حصہ یہ ہے: "مکرر آں کہ خط مولوی وجیہ الزماں خاں صاحب معتمد این سرکار بنام منشی شہاب الدین کہ ہمراہی؟ بریلی در آنجا رفتہ اند، ملفوف میرسد۔ براہِ نوازش نزد مکتوب الیہ فرستادہ جواب طلب فرمودہ بدستِ قاصد روانۂ رامپور باید فرمود (قاصد مذکور اجرت از سرکار خواہد یافت) و چوں دریں ایامِ شورش سبیلِ ترسیلِ مبالغ بجز ہنڈوی ہیچ مشکوک ہست و احتمال در وصول نیز متخیل؛ لہٰذا در صورتِ وصول و عدمِ وصولِ زرش مطلع باید فرمود۔" میرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں سرکار نے ۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۳ھ کو ہنڈوی کا پتہ اور پہلے خط کی نقل روانہ فرما دی تھی۔

(۴) نصر اللہ بیگ خاں کے لئے دیباچہ "خاندانِ نسبی" ملاحظہ ہو۔

(۵) میرزا صاحب نے اس لفظ کا املا ہر جگہ "لاڈ" لکھا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ "لارڈ" ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دلی والے اس لفظ کو "ڑ" اور "د" کے ساتھ بولتے تھے۔

(۶) لارڈ لیک سنہ ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۷۵۸ء میں میدل فوج میں نام لکھایا، اور مختلف عہدوں پر فائز رہ کر سنہ ۱۸۰۲ء میں جنرل مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۰۵ء تک ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف اور کونسل کے ممبر رہے۔ انہوں نے مرہٹوں سے جنگ کر کے ۱۸۰۳ء میں آگرہ اور ۱۸۰۵ء میں دلی فتح کی۔ بعد فتح شاہ عالم ثانی کے حضور میں باریاب ہوئے تو بادشاہ نے "صمصام الدولہ اشجع الملک، خان دوراں خان بہادر، فتح جنگ" خطاب عطا کیا۔ (تاریخ ہندوستان: ج ۳ ح ۲: ۲۱۷) لیک نے انگلستان واپس جا کر ۲۰ فروری سنہ ۱۸۰۸ء کو انتقال کیا۔

(۷) گزیٹیر آف انڈیا (ج ۱۳: ۶۱) میں سوکھہ نام کے ایک قصبہ کا ذکر ہے جو شہر متھرا سے ۱۶ میل دور کمبھیر جانے والی سڑک پر واقع اور تحصیل و ضلع متھرا میں شامل ہے سنہ ۱۸۸۱ء میں اس کی آبادی ۴۲۲۶ نفوس پر مشتمل تھی۔ باشندے کھاتے پیتے اور صاحبِ حیثیت تھے۔ پختہ بازار اور پتھر کی نردکاری کے مکانات جگہ جگہ نظر آتے تھے پیر اور منگل کو بازار بھی لگتا تھا تھانہ اور ڈاکخانہ دونوں قصبے کے اندر تھے۔

اگر یہ وہی سونک ہے جس کا میرزا صاحب نے ذکر کیا ہے، تو تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ سونا نامی

کوئی بردیرکا گاؤں تھا جو اس زمانے میں سوکھے کے نام کے ساتھ بولا جاتا تھا۔

(۸) نواب احمد بخش خاں کے لئے دیباچہ، خاندانِ نسبی ملاحظہ ہو۔

(۹) احمد بخش خاں کے جانشین سے نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والی فیروزپور مراد ہیں۔ دیگر اہلِ خاندان کی طرح میرزا غالب بھی ان سے ناراض تھے، اسی لئے ان کا نام نہیں لیا ہے محمد علاؤ الدین حبیب فرحت تخلص ساکن بمبئی کی ایک قلمی بیاض جامع مسجد بمبئی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ: "یکے از ذاماں دہلی کمشنر دہلی را کشت در عوض آں نواب را پھانسی دادند۔ کسی شاعر در تاریخ او گفتہ است۔ خوب گفت در صنعتِ منقلب کیا چرخ نے نوابی سہراب کو الٹا"۔ "نوابی سہراب" را منقلب کنند "بارہ سے باون" کی صورت میں نے کمشنر دہلی کے قاتل نواب سے، میرزا شمس الدین احمد خاں بہادر کی طرف اشارہ خیال کیا تھا۔ مگر اس صورت میں ایک عدد کی بیشی ہوتی ہے، اس لئے کہ نواب صاحب کو جمعرات کے دن ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی تھی، جو ۱۴ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۱ھ کے مطابق ہے۔ میرے والد کے مخلص دوست اور بچپن کے رفیق پروفیسر فدا علی خاں ایم۔ اے مرحوم نے اپنی قواعد اردو (نسخۂ خطیۂ مصنف، ص۱۲۶) میں اپنے دادا محمد مظفر خاں گرم رامپوری شاگرد ذوق (متوفی ۱۲۸۷ھ = ۱۸۷۰ء) کے متعلق لکھا ہے کہ سنہ ۱۲۵۲ھ میں مضافات دہلی کے رؤسا میں سے نواب سہراب جنگ نامی ایک رئیس کو بجرم بغاوت پھانسی دی گئی تھی۔ اس سانحۂ روح فرسا کی تاریخ ذیل کے قطعے میں جودتِ طبع نے بالکل جدید پیرائے میں یوں رقم کی ہے۔

ہر دستِ درازیِ ستم کس سے بیاں ہو	بے جرم و گنہ مسندِ نواب کو الٹا
تاریخ معمے میں نئی طرز سے لکھو، گرم	کیا چرخ نے نوابیِ سہراب کو الٹا

میں نے تاریخ کی کتابوں میں مضافات دہلی کے کسی اور نواب کی بغاوت اور سزا کے متعلق تلاش کی مگر ناکام رہا۔ اس صورت میں بنا دیل کی جاسکتی ہے کہ گرم مرحوم نے حسب عادت شعراس بے نظر تاریخ میں ایک عدد کی بیشی گوارا کرلی اور پروفیسر صاحب نے نوابی سہراب سے۔ نواب سہراب جنگ نام سمجھ کر بجائے نواب شمس الدین خاں کے اس سے قطعے کو متعلق کردیا

یہ بات اور ظاہر کرنے کی ہے کہ ہجری تاریخ کا تعین انڈیا آفس کی ایک بیاض سے ہوتا ہے، جس میں نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کے متعلق لکھا ہے۔ "در تاریخ ۱۳ بروز پنجشنبہ سنہ ۱۲۵۱ھ جمادی الثانی نواب شمس الدین جنت رسید شد۔ یعنی بہ تہمت خون فریزر انگریز آن را سولی داد مدبر دار کشیدند"۔ (مکتوب جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو بنام عرشی)؛ اس اقتباس سے آرزو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نواب صاحب کے معاصرین میں ایسے لوگ بھی تھے؛ جو انہیں بے گناہ اور بے قصور جانتے تھے

(۱۰) چونکہ ٹ فارسی میں نہیں ہے، اور میرزا صاحب نے اس انگریزی لفظ کو مضاف کیا تھا، اس لئے قواعد اضافت کی غلطی سے بچنے کی خاطر اسے معرّب کر لیا ہے۔

صفحہ ۹

(۱) بہادر شاہ، ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے آخری چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں لال قلعہ کے بادشاہ بنے سنہ ۱۸۵۷ء میں وطن پرستوں نے پوری دلی کا بادشاہ بنایا۔ بعدِ فتح دہلی الزام بغاوت میں رنگون کو جلاوطن کیے گئے۔ اور وہیں، ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء کو فوت ہوئے۔ میرزا صاحب نے ایک خط میں مجروح کو لکھا ہے: "۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعے کے دن۔ ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے" (اردو ی ۱۶۳)

(۲) میرزا صاحب کے عہد میں دلی والے اسی طرح بولتے تھے۔ اب صحیح تلفظ پنشن رواج پا گیا ہے۔

(۳) حکیم غلام نجف خاں کو دوسنبہ ۴ جمادی الاولی سنہ ۱۲۷۴ھ کو لکھتے ہیں: "میاں" حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا، معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ (اردوی، طبع لاہور ۱۲۴)
تفتہ کو تحریر کیا ہے: "میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں، اور یہاں قریب کیا دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے، اور نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے راجہ صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارتِ دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعدِ فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر و غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے، اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوگئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت سے میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بیگناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔ غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی پاس آوے، شہر میں ہے کون۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔" (ایضاً: ۵۹)
شنبہ ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے: "بھائی میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں

ہوتا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دارو گیر سے محفوظ ہوں کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جلسا کر بلایا نہیں گیا، خود بھی بروی کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا اور خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہونگے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں۔ مگر زندگی وبال ہے۔" (ایضاً: ۶۰)

جمعہ ۵ مارچ سنہ ۵۸ء کو لکھا ہے۔ "حاکم اکبر ہے آکر کوئی پابند دبسبب جاری نہیں کیا یہ صاحب میرے آشنائی ندیم ہیں۔ مگر میں مل نہیں سکا۔ خط بھیجا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔" (ایضاً: ۶۳)

(اپریل سنہ ۱۸۵۸ء) میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں: "پنسن کی درخواست دے رکھی ہے، بشرط اجرا ابھی میرا کیا گزر ہوگا؟ ہاں دو امیں ہیں ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قول عوام۔ جو لٹے دلدر ہوگا۔" (خطوط: ۲۲۱)

شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو حکیم احسن اللہ خاں کے اپنے مکان میں آجانے کا تذکرہ کر کے خود اپنے متعلق تفتہ کو لکھتے ہیں: "رہا میں نہ نوکری نہ غریبی، تراکی کا ربد۔ نہ جزا نہ سزا، نہ نفرین نہ آفرین، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر۔" (اردوی معلی لاہور، ۱۰)

(۴) تفتہ کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۸ء سے قبل میرزا صاحب سے تحریری راہ و رسم پیدا کرنے کی سعی شروع کر دی تھی۔ (اردوی معلی لاہور، ۲۰)

(۵) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اردوی ۳۵۔

(۶) زین العابدین خاں بہادر کے لئے وہ نوٹ ملاحظہ ہو، جو اُن کے نام کے خطوط سے قبل مندرج ہے۔

(۷) نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکان کے چچا تھے۔ اپنے والد ماجد کی شکست مرادآباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بچپن لکھنؤ میں گزارا۔ جوان ہو کر گورنمنٹ کی ملازمت کی، اور اپنی لیاقت کی بدولت صدرالصدور کے عہدے تک پہنچے۔ مرشد زادۂ آفاق میرزا محمد شاہرخ بہادر کی زوجہ اُن کی قرابت دار تھیں، اس وجہ سے لال قلعے سے بھی تعلقات تھے۔ (بہادر شاہ کا روزنامچہ ۸۲) عرصے تک میرٹھ کے صدر الصدور رہے تھے۔ سن کے بعد وہیں توطن اختیار کر لیا۔ ستر برس کی عمر میں بعارضہ سنہ ۱۲۷۴ء کو رحلت فرمائی، اور درگاہ حضرت پہلوان میں مدفون ہوئے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، میرزا غالب، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور حکیم مومن خاں وغیرہ جیسے ذی علم اور صاحبان ذوق سے پرخلوص تعلقات تھے، میرزا غالب کا اُن کے نام جو خط پنج آہنگ میں چھپ چکا ہے، اُس سے باہمی تعلقات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ انتخاب یادگار (ص ۲۱۱) میں اُن کا یہ شعر مندرج ہے:

منحصر کچھ بر نعاعت ہے کہاں جائیں کہاں۔ اے شفیع عاصیاں، ہم تیرا داماں چھوڑ کر

(۸) سید اصغر علی خاں مرحوم نواب سید عبداللہ خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکان کے چچا زاد بھائی تھے۔ انتخاب یادگار (ص ۲۵) میں لکھا ہے: "شاعر خوش مذاق ہیں آفرینش مضامین عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگرد رشید، کلام ان کا لائق داد

قابلِ سبزہ. ۲۸ برس کی عمر پائی۔ بارھویں رجب کو بارہ سو تہتر ہجری تھے کہ عارضہ
خناق میں مبتلا ہو کر میرٹھ میں رحلت پائی، وہاں سے جنازہ اُن کا دہلی کو لایا گیا، اور
درگاہ حضرت خاصہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ "ہیہات سنہ خمخانہ" جادو بد (ح اص ۱۲۷۳) میں
مندرج ہے۔ لیکن دارالانشار کی مراسلت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سنہ ۱۲۷۲ھ
میں انتقال کیا تھا۔ اُن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

(۹) نواب سید عبدالرحمٰن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب
فردوس مکان کے چچا تھے۔ جنگ دوحوڑہ کے بعد اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ بھی رامپور
چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور نواب سید محمد سعید خاں بہادر کی تخت نشینی تک دہلی اور میرٹھ
وغیرہ مقامات پر رہے۔ بعد ازاں نواب صاحب کے ساتھ رامپور آئے اور قدیم
تنخواہ میں معقول اضافہ پاکر یہیں مقیم ہو گئے۔ ۱۱؍اگست سنہ ۱۸۵۷ء تاریخ انتقال
اور مدفن رامپور رہے۔ (پروانہ بنام جانکی پرشاد مکتوبہ ۲۰ اگست ۱۸۵۷ء نمبری ۱۱۸۸)

صفحہ ۱۰

(۱) میرزا صاحب نے "بلی ما" لکھ دیا ہے جو کہ خود انہوں نے متعدد خطوں میں اس محلے کا نام
بلی ماران لکھا ہے اور آج تک ہر دہلوی وغیرہ دہلوی نے اسے بلی ماران ہی کہا اور لکھا ہے
اس لیے سہوِ قلم یقینی کرتے ہوئے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۲) یہ عربی کا ایک مرکب ہے جس کے معنی ہیں "اس کا"۔ کسی کی نظم و نثر کا کوئی ٹکڑا نقل کرنے کے
بعد پھر اسی کی کچھ عبارت نقل کرتے ہیں تو اس کے شروع میں "ولہ" لکھ دیتے ہیں، تاکہ یہ
معلوم ہو جائے کہ یہ بھی سابق الذکر ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) اگر میرزا صاحب کے تخمینے کو صحیح مانا جائے تو انہیں سنہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء سے محلہ بلی ماران
میں مقیم ہونا چاہیے۔ مجروح کے نام کے خط میں سنہ ۱۸۵۰ء کی تصریح موجود ہے۔ اس لیے
بظاہر یہی سنہ درست معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں "... یہ لکھ کہ اسد اللہ خاں بشند اے
۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے" (عود: ۸۳، اردوئے معلیٰ: ۱۶۱)
لیکن تفتہ کو ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کو لکھا ہے کہ "میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں
اور بلی ماران میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں" (غالب: ۹۳) تفتہ سے اُن کی
مراسلت برابر رہتی تھی۔ اس لیے انتقالِ مکان کے چند دن بعد ہی یہ اطلاع دینا چاہیے۔
میرزا صاحب نے شاہ نصیرالدین عرف کالے صاحب کے سنہ ۱۲۶۸ھ میں انتقال کے
بعد اُن کا مکان چھوڑا تھا۔ (باغِ دودر: ۹ الف) شاہ صاحب نے سنیچر ۹ دسمبر ۱۸۵۱ء
مطابق ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ کو انتقال کیا ہے (دہلی اردو اخبار شمارہ ۵۰ ج ۱۳ مورخہ ۱۴ دسمبر
و ۲۰ صفر) لہٰذا میرزا صاحب کو ۹ دسمبر سنہ ۱۸۵۱ء اور ۲ مارچ سنہ ۵۲ء کے درمیان مذکورہ
مکان کی سکونت ترک کرنا چاہیے۔

(۴) اس خط میں القاب کے ختم ہوتے ہی اگلی سطر سے مطالب شروع کر دیے ہیں۔

(۵) اس چار جزو کے رسالے سے "دستنبو" مراد ہے، جیسا کہ عریضے کے آخر میں اس کے نام کی
تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔ کتاب خانے میں یہ نسخہ اب تک محفوظ ہے کہ اور یہی کاتب کا نوشتہ

ہے جس نے دیوانِ اُردو کا وہ خوش خط نسخہ نقل کیا ہے جو میرزا صاحب کی طرف سے مئی ۱۸۵۷ء کی کسی ابتدائی تاریخ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں پر میرزا صاحب نے اپنے قلم سے مشکل لفظوں کے معانی لکھے ہیں۔

کتاب خانے میں ایک مطبوعہ نسخہ بھی ہے جو سنہ ۱۸۶۵ء میں لٹریری سوسائٹی بریلی کے مطبع میں چھپا تھا۔ اس کے صفحات ۲۳/۲۴، ۲۵، ۳۳، ۳۸، ۳۹، ۵۱ اور ۵۵ کے حواشی پر بھی میرزا صاحب کے قلم کے معانی درج ہیں

صفحہ ۱۱

(۱) یہ شاہی اعلان واقعاتِ دارالحکومت دہلی: ۱/ ۲۶۲ میں مندرج ہے۔

(۲) دراصل میرزا صاحب حکامِ انگریزی کی نظر میں شاہِ ظفر کے سکّے کے لئے شعر کہہ کر دینے کے ملزم تھے خود میرزا صاحب کے متعدد خطوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ستر دربار ہردی کو لکھتے ہیں "سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب۔ کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں؟ ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر... نے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ لوگ موجود ہیں، جنھوں نے اس زمانے میں مرشدآباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمروِ ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گیا اور وہ ریاست کا نام و سالِ خلعت و دربار بھی مٹا۔" اردوی : ۱۰۲/۱ عود

یوسف میرزا کو تحریر کیا ہے: "میں نے سکہ نہیں کہا۔ اگر کہا، تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر گناہ بھی ہے، تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اسے نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ، گولا انداز کا بارود بنانا، اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں" اردوی ۱)

(۳) میرزا صاحب نے لفظ سارٹیفکٹ میں پہلی "ٹ" "گوٹ" تحریر کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ سارٹیفکٹوں سے میرزا صاحب کی مراد وہ دو خط ہیں، جو قصیدے اور عرض داشت کی رسید اور ان کی وفاداری کے اعتراف میں دو گورنر جنرلوں نے انھیں بھیجے تھے۔

(۴) اصل میں القاب کے بعد اسی سطر سے مطالب شروع کر دیئے گئے ہیں۔

(۵) نواب فردوس مکان نے عرائض مورخہ ۹ نومبر و ۱۷ نومبر کے جواب میں تحریر فرمایا: دو خطوط "صحیفۂ لطف طراز، اولیں حاوی حالات نہ ملنے زرِ پنشن آپ کے، اور دوسرا مورخہ اٹھارویں ماہ نومبر سنہ حال مشعر نوید خیریت مزاج وہاج کے متواتر رنگ افروزِ چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہوا۔ اور ادیرہ مراتب مندرجہ کے مسرور اور مطلع فرمایا۔ مستغفا: جو کہ مخلص کو اشتیاقِ حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجۂ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدارِ فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایئے، اور قطعۂ ہنڈوی مبلغ دو سو پچاس روپے کا واسطے مصارفِ خدام آپ کے بلفف رقیمۂ الوداد ہذا کے مرسل ہے۔ قبول فرمایئے۔ مکرراً کہ چند غزل برائے اصلاح مرسل ہیں۔ بعد ملاحظہ کے واپس ہوں فقط

۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۲۵ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کا عریضہ نمبر ۱ ہنڈوی کی رسید اور رامپور نہ آنے کے عذر پر مشتمل ہے۔

(۶) اصل. رودینہ۔ میرزا صاحب سے یہ سہو اور جگہوں پر بھی ہوا ہے۔ میں نے جہاں کہیں مفرد کا قرینہ نہیں پایا، وہاں لعینہٖ جمع لکھ کر حواشی میں بار بار حوالہ دینا مناسب نہیں جانا۔ اہلِ تحقیق پہلے ایڈیشنوں سے مقابلہ کرکے اُن تمام مقامات کا تعین کر سکتے ہیں۔

(۷) یہاں میرزا صاحب نے ۱۲ کا ہندسہ لکھا ہے، جو لفظ صد کا عدد ہے اور فل اسٹاپ کی جگہ مستعمل تھا۔ اس کے استعمال کی جو توجیہ انھوں نے کی ہے، وہ بحیثیت املا، علامات اوقاف میں درج ہے۔ آج کل متروک ہونے کی وجہ سے یہاں اور دوسرے مقامات پر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۲

(۱) نواب فردوس مکاں کے مسودۂ فرمان میں یہ مضمون تحریر نہیں۔ ممکن ہے کہ بیضے میں اپنے قلم سے اضافہ کر دیا ہو یا کوئی اور تحریر اس کے علاوہ بھیجی گئی ہو۔

(۲) نواب مرزا خاں داغ تخلص خلف نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والی فیروز پور جھرکہ مراد ہیں۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں اپنی پھوپی عمدہ خانم کے توسط سے ابتدائی ہور دِ انعام و عنایات اور بعد ازاں ملازم سرکار ہوئے۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں سو روپے ماہوار پر اصطبل اور فراش خانے کے داروغہ بنائے گئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد رام پور کی بزمِ علم و ادب منتشر ہوئی۔ تو حیدرآباد جا کر حضور نظام مرحوم کے استاد مقرر ہوئے اور وہیں سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں انتقال کیا۔ مرزا داغ کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلوی سے کلام پر اصلاح لی تھی، اور رامپور میں شعرائے دہلی کے کامیاب نمائندے شمار ہوتے تھے۔

(۳) اس بزم آرائی کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ بعید نہیں کہ آتشِ فتنہ و فساد کے سرد پڑ جانے کی خوشی منائی گئی ہو۔

(۴) آمدہ کی جگہ آمد کا استعمال سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے۔

(۵) جناب عالیہ، نواب فردوس مکاں کی والدہ محترمہ فتح النسا بیگم کا لقب تھا، جو نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کے بھائی محمد نور خاں ولد محمد شاہ خاں بڑیچ کی صاحبزادی تھیں (گلشن نبوت قلمی) ذکر نواب فردوس مکاں :- اخبار الصنادید. ۲، ۱۷۲

(۶) دیکھو حاشیہ ۹ صفحہ ۸

صفحہ ۱۳

(۱) یہ عریضہ ۱۲ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے قبل لکھا گیا ہوگا، کیونکہ اس تاریخ کے فرمان میں سرکار نے لکھا ہے "تلطف صحیفہ آپ کا عادی . . . . نہ ہونے حکم نسب مقدمۂ پنشن کے پیشگاہ حکام سے . . . . علین انتظار میں سر ہر گشن عیون وصول فرحت شمول کا ہوا۔"

(۲) یہاں میرزا صاحب نے روانا الف کے ساتھ لکھا ہے چونکہ مکتوب نمبر ۵ وغیرہ میں انھوں نے روانہ لکھا ہے اور صحیح بھی یہی ہے، اس لیے ہر جگہ ہ کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔

(۳) لفافے پر ۱۷ اپریل ۱۸۵۹ء تحریر ہے

(۴) نواب فردوس مکاں کلب علی خاں [illegible]
اس طرف کو ابھی تک [illegible]
ملاقات کا لکھا ہے۔ اس واسطے [illegible]
تشریف فرمائی اس وقت سے کہ کب تک [illegible]
۹ رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ [illegible] اپریل سنہ ۱۸۵۹ء

(۵) لارڈ کیننگ بہادر سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۶ء [illegible]
جنرل اور سنہ ۱۸۵۸ء میں پہلے وائسرائے بنائے گئے۔ [illegible]
میں رونما ہوا۔ حکومت [illegible]
میں انگلستان واپس گئے [illegible]
استقلال، تدبر [illegible]

صفحہ ۱۴

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے [illegible]
تخلص [illegible]
مغفرت کے [illegible]
کے متواتر [illegible] سبحان اللہ [illegible]
الفاظ جامع مختصر ہیں اور [illegible]

صفحہ ۱۵

(۱) فردوس مکاں کے ۱۲ صفر سنہ [illegible] کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ
میرزا صاحب نے ان کے سفر انگلستان کے متعلق استفسار کیا تھا۔ [illegible] نے
جواب میں لکھا کہ [illegible] جو آپ نے نسبت عزیمت [illegible] انگلستان استفسار فرمایا
ہے، حال یہ ہے کہ کوئی [illegible]
تک کوئی زمانہ جانے کا مقرر نہیں ہوا ہے۔ [illegible]
کہ جس وقت زمانہ جانے ولایت کا [illegible]
عمل میں آوے گی۔ میرزا صاحب کا [illegible]
کا یہ سفر ملکہ وکٹوریہ سے ملنے [illegible]
وجہ سے ملتوی ہو گیا کہ گورنمنٹ نے خود [illegible] خلعت [illegible]
خیال لیا، چنانچہ فتح گڑھ میں یہ دربار منعقد ہوا۔ اس میں فردوس مکاں بھی شریک ہوئے
دربار کی تفصیل عریضہ ۱۴ کے حاشیے میں ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب کے اس عریضے کا آخری حصہ پھٹ گیا ہے۔ اس لئے لفافے سے تاریخ نقل کی گئی ہے۔

(۳) ملبر وہی انگریزی لفظ نمبر ہے۔ پرانے لوگ نون کی جگہ لام بولتے تھے۔ میرزا صاحب
کئی جگہوں میں [illegible] ہیں، چنانچہ [illegible] شاہزادہ جواں بخت کے سہرے میں بھی لکھا ہے کہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا۔

(۴) سات پارچوں کی تفصیل عریضہ نمبر ۸ میں ملاحظہ ہو جیغہ، جونز کی تلفظ ہے، ایک مرصع زیور کا نام ہے جسے پگڑی پر باندھتے ہیں۔ یہ مخمل کی ۷ انچ لانبی اور ۲ انچ چوڑی پٹی ہوتی ہے اس پر زردوزی کا نہایت عمدہ کام بنا ہوتا ہے اور سونے کی ایک پیڑا جس پر جواہر جڑے ہوتے ہیں اس پر ٹکی ہوتی ہے۔ سرپیچ (جسے سرپیش بھی کہتے ہیں) سونے، چاندی یا ہیرے موتی کا ایک زیور ہوتا ہے، جسے پگڑی میں سامنے کے رخ پر باندھتے ہیں
بعض اوقات اس میں سونے کی چوکور پتریں ہوتی ہیں، جو آپس میں بندھی ہوتی ہیں، اور ہر ایک میں قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔

(۵) لارڈ ہارڈنگ صاحب ہندوستان کے گورنر جنرل تھے سنہ ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے جولائی سنہ ۱۸۴۴ء سے جنوری سنہ ۱۸۴۸ء تک گورنر جنرل اور سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۸۵۴ء تک کمانڈر انچیف رہ کر اسی سال کے ستمبر میں فوت ہو گئے۔ سکھوں کی لڑائی میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انتظام مملکت میں بھی مفید اصلاحات نافذ کیں۔ جگہ جگہ اسکول قائم کئے۔ ریلوے اور آبپاشی کے محکموں میں اضافہ کیا، اور اتوار کی عام تعطیل مقرر کی۔ ان کے جلسِ دربار میں میرزا صاحب نے خلعتِ ہفت پارچہ اور مین رقمیں جواہر کی پائی تھیں، وہ احسن الاخبار بمبئی (مورخہ ۱۹ ذی الحجۃ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء شمارہ ۱۵ جلد ۲) اور بہادر شاہ کے روزنامچہ ص ۴۸ کے مطابق ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۴۵ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ ان دونوں حوالوں میں شرکا کی فہرست بھی شائع ہوئی ہے اگر اس کے اعداد ترتیب کو ظاہر کرتے ہیں، تو میرزا صاحب کا نمبر سترھواں ہونے کے سبب ان کا یہ بیان محلِ نظر رہے گا کہ "داہنی صف میں دسواں نمبر" مقرر ہے۔

(۶) لارڈ ڈلہوزی سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۴۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر کئے گئے، اور ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۴۸ء کو اس عہدے کا جائزہ لیا انھوں نے سکھوں کو زیر کر کے سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق کیا۔ ریل کے محکمے میں نئے ضابطے نافذ کئے اور صوبوں کے درمیان تاربرقی کا سلسلہ قائم کیا۔ شاہی ڈاکخانے کا نظم بھی انھیں کا رہینِ منت ہے۔ محکمۂ امورِ عامہ، جیل، جنگلات، پیمائش، اور محکمۂ تعلیمات قائم کیا۔ مجلسِ قانون ساز کا ازسرِ نو انتظام کر کے اسے وسعت دی۔ برما پر حملہ کیا، اور خان قلات اور امیر افغانستان سے معاہدے مرتب کئے۔ صوبہ برار فوجی مصارف کے لئے حاصل کیا۔ ان کے ہاتھوں بہت سی دیسی ریاستوں کا خاتمہ ہوا ہے۔ حادثۂ غدر کی ذمہ داری بھی انھیں کے کاندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ ان کے سوانح کا خلاصہ نقش استحکام اور ترقی ہے ڈلہوزی لندن واپس جا کر سنہ ۱۸۶۰ء میں بیمار ہوئے اور وہیں وفات ہوئے۔ میرزا صاحب کا یہ کہنا سہو پر مبنی ہے کہ لارڈ ڈلہوزی یہاں نہیں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخبار فوائد الناظرین (شمارہ ۲۲، ۲) مورخہ ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۴۸ء میں پہلے یہ اطلاع شائع ہوئی کہ لارڈ ڈلہوزی ۱۲ ویں نومبر کو دہلی آئیں گے۔ بعد ازاں ۲۲ نومبر کے پرچے میں (جس کا شمارہ مسلسل ہے) اخبار دہلی کے ماتحت لکھا گیا کہ "کل کے دن ۲۱ ویں تاریخ ماہ نومبر کو گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی صاحب دام اقبالہ، قریب ۱۱ بجے کے دہلی داخل ہوئے اور سلامی ہوئی)

اور کوٹھی سر طامس مٹکف صاحب بہادر میں اترے۔ خبر ہے کہ لارڈ صاحب موصوف ۲۲ ویں تاریخ ماہ حال کو، یعنی آج دن شام کے دہلی سے روانہ ہوں گے۔" اس شہادت کے بعد صرف دہلی میں دربار کا انعقاد زیر بحث آسکتا ہے۔ بظاہر یہ واقعہ ہے کہ ڈلہوزی نے دہلی میں دربار نہیں کیا ورنہ اس کی اطلاع بھی اخباروں میں شائع ہوتی۔ اور جب انہوں نے دربار نہیں کیا، تو اُن کی آمد ایک معمولی واقعہ رہ گئی جسے یاد رکھنے کی میرزا صاحب کو کیا ضرورت تھی۔ اسی سبب سے انہیں یہ خیال گزرا کہ لارڈ ڈلہوزی دہلی نہیں آئے۔

(۷) لارڈ کیننگ بہادر وائسرائے مراد ہیں۔

(۸) سکرتر، انگریزی لفظ سکریٹری کا مورد ہے۔ آگے چل کر بول چال میں پہلی "ر" بھی "ت" میں تبدیل ہو گئی اور لوگ "سکتر" کہنے لگے۔

(۹) ایڈمنسٹن صاحب ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں اضلاع شمال و مغرب میں تقرر ہوا۔ ستلج کی فتح کے بعد وہاں کی ریاستوں کے کمشنر بنا دئے گئے۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں پنجاب کے کمشنر ایبات ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک حکومت ہند کے فارن سکریٹری اور جنوری سنہ ۱۸۵۹ء سے فروری سنہ ۱۸۶۳ء تک ممالک مغربی و شمالی کے گورنر رہے۔ انہوں نے ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو انتقال کیا۔

صفحہ ۱۶

(۱) یہ فارسی کے محاورہ "مرہم زدن" کا ترجمہ ہے

(۲) عرفی کا نام جمال الدین محمد اور وطن شیراز ہے۔ ہندوستان آکر حکیم ابو الفتح شیرازی اور عبدالرحیم خان خاناں سے وابستہ رہا۔ خانخاناں نے دربار اکبری میں تقرب کرکے شاہزادہ سلیم کا اتالیق مقرر کرا دیا۔ ۹۹۹ء میں خانخاناں کے ساتھ مہم سندھ پر روانہ ہوا تھا کہ شوال میں بمقام لاہور ۳۶ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کے کلام میں شوکت اور جوش بہت ہے۔

(۳) نواب فردوس مکان نے جواباً تحریر فرمایا۔ "منفقاً بہنگام ملاقات کے اکثر بعضے صاحبان بہادر ذیشان سے تذکار رکھ رکھاؤ صاف ذاتی اور صفائی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکار دولتمدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں پیشگاہ گورنمنٹ بہادر سے بھی اسی کے مطابق ظہور میں آوے گا، کس واسطے کہ اہالیٔ سرکار ابد قرار قدر دان و قدرشناس ہیں۔"

(۴) کورٹ آف ڈائرکٹرز مراد ہے۔ سنہ ۱۷۰۸ء میں بمقام انگلینڈ ایک کچہری مالکوں کی واسطے نگرانی کاروبار ہندوستان کے مقرر ہوئی۔ لقب اس کا کورٹ آف پروپرائٹرس مقرر ہوا اس لئے کہ ہندی کچہری کے کاروبار کے لئے اچھے شخص منتخب کریں اور ترکیب اور ترتیب قوانین کی کریں۔ دوسری ایک کچہری ایسی مقرر ہوئی جو ہند کے جملہ کاروبار کے واسطے رہنمائی کرتی تھی۔ اصل میں ۲۴ آدمی تھے ان کا لقب کورٹ آف ڈائرکٹرز ہوا۔ اس زمانے تک بادشاہ انگلستان کو کاروبار ہند میں مداخلت نہ تھی۔ صاحبان کمپنی مطابق حکم اور حقوق مندرجہ فرمان بادشاہی کے کام کرتے تھے (تاریخ سلطنت انگلشیہ: ۵۰، مطبع خورشید ہند، مراد آباد ۱۸۶۷ء) کمپنی کی جماعت میں بہت لوگ ہیں۔ لیکن ان میں ۲۴ ناظم مناظم امورات ہیں۔ اُن کی منظوری کے بدون کسی امر اہم کی تجویز قطعی نہیں ہوتی، اور انہیں کو کورٹ آف ڈائرکٹرز بولتے ہیں۔ سب حکام انہیں کے

حضور سے مقرر ہوتے ہیں۔ مگر گورنر یعنی مدار المہام اور کمانڈر انچیف یعنی سپہ سالار کے نصب کرنے میں پسند و منظوری تخت نشین سلطنت کی لازم ہے۔" (تاریخ ہند، سدا سکھ لال ۱۰۹، مطبع نور الابصار ۱۸۵۷ء) یکم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کے ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کے اعلان کے ذریعے گورنر جنرل کو وائسرائے یعنی نائب سلطنت کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ اور کمپنی سے عنانِ حکومت لے کر براہِ راست تاج برطانیہ سے مملکت ہندوستان کا تعلق کر دیا گیا چنانچہ لارڈ کیننگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخر گورنر جنرل اور ملکہ کے اول وائسرائے تھے (تاریخ سلطنتِ انگلشیہ، ذکاء اللہ، ج ۳، ۱/۲)

(۵) نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں مراد ہیں۔

(۶) میرزا صاحب نے اس عریضے میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ اخبار الصنادید (۲) ۹۔۱۱۰ کے مطابق حسب ذیل ہے۔

"لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل نے ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۵۵ء مطابق ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۶ھ کو مقام فتح گڑھ میں ایک عالیشان دربار منعقد فرمایا ۔ ۔ ۔ اس دربار میں بہت سے دیسی رؤسا اور بہت سے یورپین معزز حکام خصوصاً کمانڈر انچیف صاحب شریک تھے ۔ ۔ ۔ دربار عام میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں سے مخاطب ہو کر کہا: "مجکو بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ ان خدمات کے عوض جو آپ نے ملکۂ معظمہ کی کیں، آج آپ کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنی ذاتِ خاص سے زمانۂ غدر میں نہایت مستعد اور صادق رہے، اور آپ نے باوجود خوف جان دریاست کے گرد و نواح میں نہایت مشقت اور مستعدی سے حکومت برقرار رکھی، اور ملکہ معظمہ کے افسروں کی مدد بقدر امکان بخوبی کی۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آپ نے ایک مجمع کثیر ہم قوم ملکہ معظمہ کی جانیں بچائیں، اس کو سب آفتوں سے محفوظ رکھا، اور ان کو ہر طرح کی آرائش دی، حالانکہ وہ زمانہ چاروں طرف خوف سے گھرا ہوا تھا۔ میں بڑی خوشی سے روبرو سپہ سالارِ افواج ہند ملکہ معظمہ اور بہت سے معزز افسر اور حاکمانِ ملکی کے۔ جو گرد و نواح اور دیگر مقامات ہندوستان میں عہدہ ہائے جلیلہ پر منصوب ہیں۔ آپ کے حسنِ خدمات کا اقرار کرتا ہوں مجھکو یقین ہے کہ آپ کی کارگزاریوں کو لوگ ہرگز نہ بھولیں گے۔"

اس دربار میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں کو تین ہزار روپے کا خلعت عطا کیا۔ اور سلامی کے بجائے گیارہ کے بجائے تیرہ مقرر ہوئے۔ علاوہ اس کے فرزند دلپذیر کا خطاب عنایت ہوا، القاب و آداب ان الفاظ کے ساتھ قرار پایا۔

"نواب صاحب مشفقِ بسیار مہربان کرم فرمائی مخلصاں سلامت"

بعد ازاں ۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کے سکریٹری کے نام حسب ارشاد گورنر جنرل بہادر ایک خط لکھا اس خط کی دفعہ ۵ میں تحریر تھا۔ "گورنر جنرل نے ۔ ۔ ۔ نواب صاحب کو مطلع کیا کہ ان کی مستحکم وفاداری اور اعلیٰ درجے کی امداد کے سبب، جو انھوں نے گورنمنٹ کو دی ہے، ان کو پرگنہ کاشی پور

ضلع مراد آباد، جس کی جمع ایک لاکھ چار ہزار چار سو روپے سالانہ ہے، معافی میں بخشا ہے، جس کو وہ اور اُن کے وارث اپنی جاگیر کے ایک ٹکڑے کے طور پر اسے ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھیں۔"
بعد ازاں ضلع بریلی کے شمال سے جنوب کی جانب ایک پتلی دُمچی کی طرح کا لمبا علاقہ، جو ۲۳۶ مواضعات جمعی ایک لاکھ ۲۸ ہزار ۵ سو روپے ۴ آنے پر مشتمل ہے، ۲۴ جون ۱۸۶۰ء کے مورخہ عہد نامے کی رو سے ہمیشہ کے لئے عطا ہوا (عہد نامجات: ۲/ ۱۰۰)
اس عطیے کی تہنیت میں مرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں کو لکھا

ای آنکہ خود بمہر ہمی پروری مرا
از غیب، مزدِ کارِ تو اجرِ عظیم باد

رای تو در زمانہ بامضای کارہا
با اہتمام سہمِ سعادت سہیم باد

در صبحِ دولتِ تو، ز گلہای رنگ رنگ
دائم مشامِ دہر ز بوی شمیم باد

آن دم کہ مردہ را اثر زندہ ساختی
در باغِ طالعِ تو، ہوای نسیم باد

یا نسد آب، گرا برہمت بہر نفعِ گرد
ہر قطرۂ باراں، گوہرِ دُرِ یتیم باد

ہر صبحہ کہ وصیح دی ار سہر امرسب
فارغ ز سنگِ زحمتِ تقدیم تیم باد

گر بہر جو س پیرِ دعائی کنم چہ باک!
این نغمہ ہم گزیدۂ طبعِ سلیم باد

آزادہ ام، خلوص و فا شیوۂ من است
راہم درای مسالکِ امید و بیم باد

چوں رہروی کہ بر نمطِ جادہ میرود
پیوستہ سیرِ من بخطِ مستقیم باد

مانندِ فکرِ من، رخِ بختِ تو دلفروز
مانندِ کلکِ من، دلِ دشمن دو نیم باد

پابستۂ زمان و مکاں نیست دردمند
گر خود رود بکعبہ، مریں در مقیم باد

شادم بگنجِ امن و نگویم کہ بندہ را
خشتی ز زرِ خالص و خشتی ز سیم باد

مقصود از لباس ہمان پوششِ تن است
پوشش گر از حریر نباشد، گلیم باد

بالجملہ ایں سہ بیت کہ سر جوشِ فکرِ منست
درخوردِ لطفِ خاص و عطائے عمیم باد

نوابِ مہر فر منوچہر چہر را
حاصل کلام یوسف و قربِ کلیم باد

جوں غنچہ کہ پہلوی گل بشگفد بباغ
ملکِ جدید، شاملِ ملکِ قدیم باد

ہر دم ترا بخلوتِ راز و ببزمِ اُنس
روح الامیں مصاحب و غالب ندیم باد

(کلیاتِ غالب فارسی: ۲۲)

اس قطعے کی تاریخ نظم کا پتا نہیں چلتا، لیکن ۲۷ نومبر کے مکتوب میں اس کا مذکور نہ ہونے کے باعث خیال ہے کہ اس تاریخ کے بعد لکھا گیا، اور اسی مہینے کی کسی آخری تاریخ کو یا اوائل دسمبر کے شروع میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال ہوا۔ نواب صاحب کی تاریخ روانگی و آمد صاحب اخبار الصنادید نے ذکر نہیں کی۔ خود نواب صاحب نے ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۶ھ، ۸ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو لکھا ہے: "یہ مخلص بتاریخ ۱۲ اس مہینے کے طرف فتح آباد کے روانہ ہوگا اور بتاریخ ۱۸ اس مہینے کے معاودت کرکے رامپور پہنچے گا۔"
(مثل نمبر ۷۵) بعد ازاں ۲۵ ربیع الثانی مطابق ۲۲ نومبر کو تحریر فرمایا ہے کہ "بتاریخ ۱۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء مخلص بخیریت تمام فائز اینجا گردید۔" (مثل نمبر ۷۸)

صفحہ ۱۷

(۱) میرزا صاحب نے اس لفظ کو سہواً "گھوں" لکھ دیا ہے۔

(۲) یہاں میرزا صاحب کو اصولاً "روپے" بصیغۂ جمع لکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن محاورے میں کبھی "دو ہزار روپیہ آیا" بصیغۂ واحد بھی بولتے ہیں اسی سبب سے میں نے یہاں محسوب نہ ہوا، اور مرحمت ہوا کے پیش نظر "روپیہ" مفرد ہی رہنے دیا ہے

(۳) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۰ جمادی الاولی ۱۲۷۶ھ (۱۵ دسمبر ۱۸۵۹ء) کو تحریر فرمایا: "منفقا! بپاس ارقام سابق کے کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موانست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دو سو روپے کی سوائے مشاہرہ معینہ معطوف رقیمۂ الوداد ہذا کے مرسل ہے، اور حسب ملاحظت آپ کی لطف فرمائی سے یہ ہے کہ رسید ہنڈوی مذکور سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔ اور سابق میں چند مرتبہ درباب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں؛ لیکن اب تک آپ نے سرور ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔ اب لازم اشفاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرماویں اور مخلص کو مشکور الطاف کا کریں۔"
اس ارشاد کی تعمیل میں میرزا صاحب صبح پنجشنبہ ۱۹ جنوری سنہ ۶۰ء کو دلی سے روانہ ہو کر جمعے کے دن ۲۷ جنوری کو وارد رامپور ہوئے۔ سفر کی تفصیل کے لیے دیباچہ ملاحظہ ہو۔

(۴) لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے دوران قیام رامپور میں یہ عریضہ لکھ کر فتح محمد خاں صاحب کے توسط سے کیمپ میں پیش کیا تھا۔ مقام کا نام لفافے پر درج نہیں لیکن جوابی فرمان کے مسودے میں "از مقام کمہریا" ہے۔ جو تحصیل سوار کا ایک

صفحہ ۱۸

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اپنے بھائی میرزا یوسف خاں کی پنشن کے اجرا کی کوشش کی۔ یوسف خاں ایام غدر میں بڑی بیکسی اور تنہائی کی حالت میں فوت ہوئے تھے اور میرزا صاحب ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شرکت نہ کر سکے تھے۔ امن قائم ہو جانے پر میرزا صاحب نے ان کی پنشن کے لئے کس طرح سلسلہ جنبانی کی اور آیا اپنی بیوہ بھاوج اور بھتیجی کے لیے یہ پنشن یا اپنے لیے، اس کا حال معلوم نہ ہو سکا، اس لئے کہ آئندہ کسی خط میں میرزا صاحب نے ان کی پنشن کے متعلق نہیں لکھا۔

(۲) اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۸ رمضان سنہ ۱۲۷۶ھ (۱۹ اپریل سنہ ۶۰ء) کو القاب و آداب کے بعد تحریر فرمایا: "مشفقا! جب کوئی مسرت پیش آنے والی ہوتی ہے، تو آغاز ہی سے مقدمات سرور پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے سامان نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل کو انبساط، طبیعت کو نشاط ہو۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ ۱۹ تاریخ اپریل سنہ حال پہلے تو ایک لاکھ بیس ہزار دیا ۲۸ ہزاری کی جاگیر پر دخلدہانی کا خریطہ آیا۔ میں اسے پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کا نامہ سرور افزا آیا۔ اس سے آپ کی پنشن کی بحالی کا مژدہ پایا

نشۂ سرور دوبالا ہوگیا اور اس قدر بالیدگی اور خوشی حاصل ہوئی کہ زینہار بیان اس کا بجل زبان و قلم نہیں۔ بار خدایا مبارک ہو۔ سپاس منعم حقیقی ادا نہیں ہوسکتا۔ اس وقت میں بلا نقصان پنشن کا جاری ہونا محض شان قدرت باری ہے۔ شکر اس کے احسانات کا کہاں تک ادا کیجیے! عجب قدرت نمائی فرمائی ہے۔ دل کو طرفہ مسرت ہاتھ آئی ہے۔" تفتہ کے نام کے ۹ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کو زر پنشن وصول کیا گیا (اردوی: ۹۰) وصول شدہ رقم (دو ہزار دو سو پچاس روپے) کے خرچ کی پوری تفصیل کے لئے اردوی: ۱۸۲، خط بنام مجروح ملاحظہ ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب میرزا صاحب کے خط میں ماہ اپریل کی ۲۲ تاریخ درج ہے، تو اس صورت میں سرکار کا ۱۹ تاریخ کا خط اس کا جواب کس طرح ہوسکتا ہے۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ میرزا صاحب کی تاریخ میں سہو ہوا ہے۔ دراصل انھوں نے ۱۲ تاریخ کو خط لکھا ہوگا جس کا ۲۲ بنجانا بہت آسان ہے۔ چونکہ مثل میں اور کوئی خط ایسا نہیں ہے، جس میں پوری پنشن کی بحالی کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ اس لئے مذکورہ قیاس کو مزید تقویت بہم پہنچتی ہے۔

(۳) اصل خط میں "بریلی کے ملک" ہے۔ حالانکہ "بریلی کا ملک"، یا "بریلی کے ملک کے ملنے کی" ہونا چاہیئے۔ چونکہ خط میرزا کے قلم کا نہیں ہے، اس لئے میں نے سہو ناقل پر محمول کرکے اصلاح کردی ہے۔

(۴) یہ خط جو بعد میں خرید اگیا ہے، اصل مکتوب کی بغیر تاریخ کی نقل ہے، اس لئے تاریخ تحریر کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔ البتہ اس میں بریلی کا علاقہ ملنے کا ذکر ہے، جو اپریل سنہ ۶۰ء میں فردوس مکاں کو ملا تھا۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ سرکار کے مکتوب مورخہ ۱۲ اپریل سنہ مذکور کے جواب میں میرزا صاحب نے اپریل باقی سنہ ۶۰ء کی کسی تاریخ کو لکھا ہوگا۔ سنہ ۵۸ء میں میرزا صاحب نے بریلی کا علاقہ ملنے کی مبارکباد جس بنا پر دی تھی اس کے بارے میں ابھی تک یقینی علم حاصل نہیں ہوسکا۔ بظاہر یہ خیال ہے کہ میرزا صاحب نے دہلی میں یہ افواہ سنی اور اسے باور کرکے قصیدے میں ذکر کردیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ کاشی پور کا علاقہ ملا ہے، جس سے میرزا صاحب کے علم کی تغلیط ہوگئی آخر میں بریلی ہی کے علاقہ میں سے گانو دیئے گئے۔ اس کی اطلاع پاکر میرزا صاحب نے یہ خط لکھا اور اپنی پچھلی اطلاع کی صداقت کھل جانے پر اپنے آپ کو لسان الغیب کا خطاب دیا۔

صفحہ ۲۰

(۱) کلیات غالب: ۳۲۷۔ میں یہ قصیدہ چھپ چکا ہے۔

(۲) محرم سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۶ جولائی سنہ ۶۰ء) کو سرکار نے تحریر فرمایا ہے کہ میر منشی کو ہدایت کردی گئی ہے کہ آئندہ سے آپ کے حسب ایما ہنڈی روانہ کی جایا کرے (مثل نمبر ۱، صیغہ احباب عہد فردوس مکاں)

(۳) عریضہ نمبر ۲۲ تا ۲۶ میں خلاف معمول لفظ "حضرت" ساقط ہے۔

(۴) میرزا صاحب کا یہ نسخہ کلیات فارسی حسب تصریح فرمان مورخہ ۱۸ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۱ء) ڈاک کے ذریعہ حضور میں پیش ہوا۔ نواب صاحب نے اس کو مذکورہ

فرمان میں آیئنۂ جہاں نمائی مخزنِ نکاتِ مسرت افزا" اور فرمان مورخہ ۲۱ رمضان و ۱۲ اپریل میں "ایک دریائے مواج ہے کلو ہزاراں لآلیٔ معنی ہے" تحریر کیا ہے۔ یہ نسخہ کتب خانۂ سرکاری میں محفوظ ہے۔ خط نہایت صاف کاغذ نیلا اور متعدد مقامات پر میرزا صاحب کی تحریر سے مزین ہے اس کے کاتب کے بارے میں میرزا صاحب نے نواب ضیاء الدین خاں بہادر کو لکھا تھا: "آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ اچھا اگر ایسا ہوا، اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً اسپیشل ڈاک رامپور جاؤں گا، اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔" (اردوی ۲۸۹)

صفحہ ۲۱

(۱) تورہ، مختلف انواع کے لذیذ کھانے جو کم از کم ۱۱ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ خوانوں میں لگا کر بڑے تکلف کے ساتھ تقریبات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ نوراللغات ۲، ۲۴۲

(۲) اس عریضے میں نواب فردوس مکاں کے منجھلے صاحبزادے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کا حوالہ ہے۔ یہ شادی نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کی نواسی کے ساتھ ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۷ جون سنہ ۱۸۶۱ء) کو قرار پائی تھی۔ مہینوں سے تیاریاں ہوئی تھیں، ملازمان ریاست کو خلعت اور عام باشندگانِ شہر کو کھانا تقسیم ہوا تھا۔ سارے شہر میں جا بجا رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کی گئی تھیں۔ ریاست کے بیرونی متوسلین اور احباب کے نام دعوت نامے جاری ہوئے تھے۔ میرزا صاحب نے علائی کو ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کو لکھا ہے "والیٔ رامپور نے بھی تو مرزادے کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں معدوم محض ہو گیا ہوں۔ تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔" (اردوی: ۳۰۴ و ۳۰۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر ضعف طبع سفر سے مانع رہا

میرزا صاحب نے آگے پیچھے ایک تہنیت نامہ اور دو قطعات مبارکباد نواب جناب کی خدمت میں روانہ کیے۔ قطعات منسلک میں تو نہیں ہیں، لیکن کلیات فارسی (نولکشوری ایڈیشن ۱۳۱) میں شائع ہو چکے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دید در یوسف علی خاں کر فروغ رای او | مہر تاباں بر دقسط فیض دمن ہم یافتم
از دلیعہدش سخن رانم کہ چوں ماہ منیر | طلعتش را دیدہ روشن ساز عالم یافتم
واں دگر فرزانہ فرزند فرہمندش کہ ہست | کوکبی کش در دل افروزی اسلم یافتم
خواست تا سازد با یین ہنش کدخدا | شاد گشتم، چوں خبر زیں جشن اعظم یافتم
بہرہ بردم در تصور زاں ہمایوں انجمن | لیک در خود طاقت رنج سفر کم یافتم
بزم طوی نو رخ حیدر علی خاں را بدہر | خوشتر و خرم تر از بزم کی وجم یافتم

سال این دولت تزاشادی بامعانِ نظر — "مشتری" "با زہرہ" "در" طالع فراہم یافتم

اس قطعے میں مصرع آخر کے الفاظ (زہرہ مشتری طالع) سے سال جشن کے اعداد ۱۲۷۷ نکلتے ہیں نواب فردوس مکاں کے فرمان مورخہ ۵ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۷ مارچ ۱۸۶۱ء) میں اس کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے آغاز مارچ سنہ ۶۱ء میں لکھ کر بھیج دیا تھا۔

دوسرا قطعہ برسات میں بھیجا گیا تھا اس میں فرماتے ہیں

بہار ہند کہ نامند برشکال آں را — پس از دو سال براہل جہاں مبارکباد
باغ و گشت و بیابان و کوہ، سرتاسر — سحاب و سبزہ و آب روان مبارکباد
رسیت عہد سموم و وزید باد خنک — زجان بہ تن، دگر از تن بجاں مبارکباد
گرچہ رحمت عامست، لیک بالتخصیص — برامپور گراں تا گراں مبارکباد
زبرگ برگ بستاں کہ گرد آں شہر ست — رسد بگوش چناں کز زباں مبارکباد
زانبساط براست آں چناں کہ از رگ ابر — بجائے قطرہ تراود ہماں مبارکباد

سبب مراد گر آیم کہ اہل دانش را — شود ہر آئینہ خاطر نشاں مبارکباد
خود ابر و باد بگیتی ز دریا ز نبود... — عطیہ ایست کہ بر ہمگناں مبارکباد
معاف باشم، اگر خود ز خویشتن پرسم — برامپور خصوصا چساں مبارکباد
چو برامپور بود وجہ بارہ ردی دہر — زہر چہ این ہمہ گل کردآں مبارکباد
ز فیض ہمت فرمانروای آں شہرست — کہ در دخلق لب دہر زماں مبارکباد
ظہور یمنت کہ خدائی سر زند — برآن رئیس سپہر آستاں مبارکباد
کہ میہمان حق است آں دما تفیلی او — نزول مائدہ بر میہماں مبارکباد
بجیب و دامن مردم زبخشش نواب — متاع خاصہ دریا و کاں مبارکباد
کشائش در گنجینہ، وانگہ از در گنج — بپرستاری فتن پاسباں مبارکباد
بطالبانِ زر و سیم، سیم و زر فرخ — بسائلان تہی کاسہ ناں مبارکباد
بمن کہ تشنہ لب بادہ ہی پر زر و رم — از آں میان دو سہ رطل گراں مبارکباد
نگو ز شادیِ اہل زمین کہ می گویند — فرشتگان بلند آسماں مبارکباد
بدیں ترانہ کہ ہاں ای امیر شاد نشاں — نوید فرحی جاوداں مبارکباد
بشہریار و ولیعہد و شاہزادۂ عہد — خوشی و خوبی و دامن داماں مبارکباد
ازاں جہت کہ ستائش نگار نوابی — تراہم، ای اسد اللہ خاں مبارکباد

نواب فردوس مکاں نے غرہ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء) کو تحریر فرمایا:... قطعات مبارکباد اور تہنیت نامۂ شادی کتخدائی برخوردار کامگار محمد حیدر علی خاں بہادر ایام فرحت التیام میں سرور افزائی خاطر نیاز ہوئے، اور مرتبہ ہزار اں مسرت و رشادمانی کا ارزانی کیا۔ سبحان اللہ! ہر ایک شعر قطعوں اور تہنیت نامے کا مضامین میمنت آگیں اور معانی لطافت تضمیں سے ایسا مملو تھا کہ دعول اس کا احاطۂ تحریر و تقریر سے متجاوز ہے۔ اللہ تعالے آپکو ابدالدہر سلامت باجمعیت رکھے۔" (نقل نمبر ۲، صیغہ احباب فردوس مکاں)

اِس فرمان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورۂ بالا قطعۂ مبارکباد موسم برشکال میں ۱۱ جولائی سے قبل سرکار کے حضور میں پیش ہو گیا تھا اب صرف تہنیت نامہ باقی رہ جاتا ہے۔ بظاہر عریضۂ نمبر ۲ تہنیت نامہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کو مذکورہ فرمانِ تہنیت نامہ قرار نہیں دیسکتے اس لیے کہ فرمان سے مترشح ہے کہ تہنیت نامہ بھی منظوم تھا، اور یہ عریضہ منثور ہے۔ علاوہ بریں اس کو تہنیت نامہ قرار دینا اس لئے ناممکن ہے کہ یہ لفافے کی انگریزی تاریخ کے مطابق ۵ جولائی کو لکھا گیا تھا، اور تہنیت نامہ کا ذکر نواب صاحب کے ۱۱ جولائی کے فرمان میں آچکا ہے۔

خزانے کے آداسجے سے پتہ چلتا ہے کہ تورہ اور خلعت کے روپے جس کا میرزا صاحب کے مکتوب میں شکریہ ادا کیا گیا ہے، پہلی محرم سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء) کو یہاں سے بھیجے گئے تھے یہی تاریخ سرکار کے اس فرمان کی ہے جس میں میرزا صاحب کے قطعاتِ مبارکباد اور تہنیت نامے کا ذکر ہے۔ تو گویا فرمانِ سرکار کے ساتھ ہی ہنڈوی بھی روانہ ہو گئی تھی۔

(۳) میرزا صاحب کے اس حسن طلب پر سرکار نے انھیں کچھ بھیجا یا نہیں، اس کے متعلق تمام کاغذات خاموش ہیں۔ غالباً سرکار نے اسے میرزا صاحب کی ظرافت پر محمول کیا ورنہ ضرور روپیہ ارسال فرماتے۔

(۴) حسن علی خاں کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون صاحب تھے

(۵) علی بخش خاں شیخ محبوب بخش ابن شیخ امان اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ ۱۴ شوال ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اور نانا ریاست کے پرانے نوکر اور خدمت گزار تھے۔ انھوں نے بھی ایام غدر میں بڑی جانفشانی اور خیر خواہی سے کام کیا، اور صلے میں گورنمنٹ سے پانچ ہزار روپیے کا خلعت، تلوار طلائی، گھوڑی اور تین ہزار چودہ روپیے سالانہ کی جاگیر ضلع مرادآباد میں انعام پائی۔ نواب خلد آشیاں نے تخت نشینی کے ایک سال بعد انھیں چالیس ہزار روپیے نقد یکمشت عطا کیے۔ اور جب یہ بیمار ہوئے تو دو بار بہ نفس نفیس انکی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انھوں نے ۲ محرم سنہ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) کو رامپور میں انتقال کیا اور مولانا جمال الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ آل محمد مارہروی نے (دیوان تواریخ: ۴۲) یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:

علی بخش خاں مرد نامی گذشت ... بیامرزدش فضل رب غفور
بتاریخش آل محمد نوشت ... شدہ جنتی نایب رامپور

اولاد میں مولانا محمد علی مرحوم بین الاسلامی شہرت کے قومی رہنما ہوئے ہیں۔ (اخبار الصنادید: ۱۲۱، اور تذکرہ کاملان رامپور: ۲۶۸)

(۶) میر سرفراز حسین میر مہدی مجروح کے بھائی اور میر افضل علی عرف میرن صاحب اُن کے دوست تھے۔ میرزا صاحب سے بھی ان دونوں کے خروانہ تعلقات تھے۔ اردوئے معلی اور عود ہندی میں اُن کے نام متعدد خطوط درج ہیں۔ میرزا صاحب نے اُن کی پریشان روزگاری کا حال دیکھا تو خان صاحب کے نام تعارفی خط دے کر رامپور بھیجا

شومیِ بخت سے اس وقت یہاں ملازمت نہ مل سکی، اور یہ دونوں سو روپے کی زیرباری کے بعد واپس چلے گئے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء کو میر مہدی کو لکھا ہے: "سید صاحب، کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال مفصل جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لوگے، میں کیا لکھوں! میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انہیں سے سنا ہے۔ ان کا اس طرح ناکام پھرنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے۔ لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کچھ نہ ہوگا سو روپے کی ناحق زیرباری ہوئی۔ چونکہ یہ زیرباری میرے بھروسے پر ہوئی، تو مجھے شرمساری ہوئی۔ لیکن میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور رسوائیاں یہاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی، میر سرفراز حسین کی زیرباری سے دل کڑھتا ہے۔" (اردوی: ۱۸۵) بعدازاں ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۱ء کو پھر لکھتے ہیں: "بھائی تم سچ کہتے ہو۔ بر سر اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد، لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیرباری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح سے یہ آئے ہیں۔ اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے، لیکن واللہ میرے عقیدے اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتہ یونہی ہوگا۔" (ایضاً: ۱۵۷)

نواب فردوس مکاں کے ایک فرمان مورخہ ۱۶ اگست سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کی جولائی کی تنخواہ میں سے پچیس روپے نقد میر سرفراز حسین صاحب کو (آغا لباً زادِ راہ کے لیے) منشی سیلچند کی معرفت دیے گئے تھے۔ (مثل نمبر ۱۹، صیغۂ اجناس عہد فردوس مکاں)

(۷) اس لفظ کو میرزا صاحب نے "بالمد" لکھا ہے۔

صفحہ ۲۲

(۱) نواب صاحب کے مذکورہ سفر کی تفصیل یہ ہے، کہ "... جنابہ ملکۂ معظمہ وکٹوریہ انگلستانی کا ایک فرمان ۲۵ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء کو صادر ہوا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

ما بدولت نے اپنی مرضی خاص اور علم کامل اور عزم مبارک سے ایک رتبہ جدید عالی جو آج سے دوام کے لیے خطاب، موسٹ اگزالٹڈ آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا سے موسوم ہو کر مشہور ہوگا، تجویز اور ایجاد کیا ہے! اور ما بدولت کا ارشاد ہوتا ہے کہ رتبہ مذکور میں ایک شخص ساورن (سردار اعلیٰ) ایک گرانڈ ماسٹر (سردار) اور پچیس (۲۵) نائٹ (بہادر) شریک رہیں اور والیان ہند اور سرداران ہندوستانی اور ہماری رعایا میں سے وہ اشخاص، جو اس قسم کی لیاقت رکھتے ہوں اس رتبۂ عالی سے محروم نہ کیے جائیں ما بدولت کی تجویز افرمیں سے ما بدولت کے عزیز مشیر اکبر چارلس جان ارل کیننگ، گورنر جنرل ہندوستان، اس ... رتبے کے اول سردار مقرر ہوئے اور یہ مقتضای دانشمندی اور مصلحت ہے کہ رتبۂ مذکور کا سردار ایسے

اشخاص کو جو وقتاً فوقتاً نا بدولت کی تجویز اقدس سے نامزد ہو کر اس رتبے کے بہادر مقرر کیے جائیں، عہدۂ موسومۂ نائٹ بچلر عطا کرنے کا مجاز ہے ۔۔۔۔۔
اس کام کے واسطے لارڈ کیننگ صاحب نے ایک دربار الہ آباد میں مقرر کرنے کی تجویز کی اور نواب سید یوسف علی خاں بہادر کو بھی بلایا۔ نواب صاحب مع خدم وحشم الہ آباد گئے۔ یکم نومبر سنہ ۱۸۶۱ء کو ایک شاہانہ دربار منعقد ہوا ۔۔۔ جب تمام اہل جلسہ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو نواب صاحب بہادر تخت شاہی کے محاذی تشریف لے گئے۔ اور گورنر جنرل نے اپنے ہاتھ سے اس رتبے کے تمغے عطا فرمائے اور کھڑے ہو کر بیان کیا ۔۔۔ چونکہ یہ رتبہ سب سے پہلے آپ صاحبوں کو عطا ہوا ہے امید ہے کہ آپ ہند کے باشندوں میں ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ آپ کا طرز عمل دیکھنے سے ہند کے سرداروں یا باج گزاروں کو ملکہ معظمہ کے ساتھ محبت دلی اور اتحاد قلبی پیدا ہو۔" بعد اس تقریر کے دربار برخاست ہوا، اور نواب صاحب گورنر جنرل سے رخصت ہو کر اپنے دارالریاست کو واپس تشریف لائے۔" (اخبار الصنادید ۲، ۱۱۳-۱۱۶)

نواب صاحب کے فرمان بنام غالب مورخہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸ اکتوبر سنہ ۶۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۶۱ء کو الہ آباد روانہ ہونے کا ارادہ اور تقریباً ایک ماہ رامپور سے باہر رہنے کا خیال تھا (مثل نمبر ۴۳)، لیکن میرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں تشریف لے آئے تھے۔

(۲) میرزا صاحب کو قولنج کا پہلا دورہ ۲۴ مئی سنہ ۱۸۵۸ء کو ہوا تھا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں "بھائی، وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا سخت کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا ۔۔۔۔۔۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔" (خطوط ۱: ۳۵)
اس کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں: "نہ تندرست ہوں، نہ رنجور ہوں، نہ زندہ بسنور ہوں۔" (ایضاً: ۱۲۰) ۱۱ نومبر ۱۸۶۱ء کو سرکار کے خط میں یہ لکھا ہے کہ "ایک مہینے سے بیمار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت ستمبر کے آخر ہی میں جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی، اور تقریباً ۱۱ یا ۱۲ اکتوبر کو قولنج کا جو دورہ ہوا، اسی کا یہ پیش خیمہ تھا۔ سنہ ۱۸۶۲ء کے آخری مہینوں میں یہ دورہ جلد جلد ہونے لگا تھا۔ ۴ نومبر سنہ مذکورہ کو نواب میر غلام بابا خاں کی دعوت قدوم سورت پر لکھتے ہیں: "ایک ہفتہ، دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج دوری کی شدت ہوتی ہے۔" (اردو ۹)

(۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو تشدید یا لکھا ہے۔

(۴) ان دونوں لفظوں کو میرزا صاحب نے ایک الف زائد کے ساتھ "باالفعل" اور "باالکل" لکھا ہے۔

(۵) اس مثنوی کے متعلق لفافے کی پشت پر نوٹ ہے "تاریخ نزد منشی سیلچند ماند" سرکار نے اس کی تعریف میں، ۱۱ نومبر کو تحریر فرمایا: "سبحان اللہ ہر تاریخ بے بدل اور طرز

نادر اور نخز جربے مثل ہے۔"

صفحہ ۲۳

(۱) نورالدین ظہوری، ترشیز (ایران) کا باشندہ تھا۔ سنہ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں دکن آیا اور ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کیا، اور سنہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں فوت ہوگیا۔ اس کی سہ نثر اور کلیات مشہور ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "فرمایئے" بتشدید یا لکھا ہے۔

(۳) خدا جانے کس بات سے میرزا صاحب کو شک گزرا کہ سرکار کچھ کشیدہ ہیں۔ ورنہ مثلوں میں تو سرکار کے سنہ ۷۲ء کے لکھے ہوئے خیریت جوئی کے فرمان تمامی تعداد میں موجود ہیں۔

(۴) یہ عبارت عریضے کے آخر میں مہر کے بعد تحریر ہے۔

صفحہ ۲۴

(۱) لفافے پر "یوم جمعہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ء" لکھا ہے۔

(۲) سر رابرٹ منٹگمری صاحب مراد ہیں۔ یہ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے جنوری سنہ ۱۸۶۵ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے تھے۔ قدر بلگرامی کے نام کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ان کے دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ دربار کے بعد منٹگمری صاحب نے بلا کر اپنی طرف سے خلعت عطا کیا، اور وہیں دربار اَنبالے کے متعلق گفتگو ہوئی۔ فرماتے ہیں: "..... رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ بہادر قلمرو پنجاب یہاں (دلی) آئے، دربار کیا، میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن دس بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔" (اردوی، ۲۰۶، لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء) شیونرائن کے نام کے خط میں فرماتے ہیں ..... "بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے۔ دربار کیا، خیر گرد، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا، اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی، یہ آخر فروری ہے، اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس داہنے ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں، اٹھنا دشوار ہے۔ بہرحال سوار ہوا۔ گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور نہیں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی، یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق، وقت رخصت خلعت دیا، اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہ محبت دیتے ہیں، اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی نمبر الہبر اور خلعت مقرر گیا انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا: "خیر اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا"۔ اس پھوڑے کا برا ہو انبالے نہ جا سکا۔" (اردوی، ۳۸۲-۳۸۳)

(۳) لارڈ الگن بہادر مراد ہیں۔ یہ لارڈ کیننگ کے بعد ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء میں جائزہ لیا اور ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۳ء کو فوت ہوگئے۔ میرزا صاحب ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں۔ "۱۱ جمادی الثانی سال غفر مطابق ۲۹ دسمبر سال گیا

غضب ہے ہے، یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔" (اردوی: ۴۰۵)

صفحہ ۲۵

(۱) میرزا صاحب نے ۱۳ رمضان (۴ مارچ سنہ ۶۳ء) کو تفتہ کے نام حسب ذیل خط لکھا ہے: "...... ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو ۷ پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدۃ العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالے جاؤ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پہ گزری گویا مردہ جی اٹھا۔ مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گزرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔ لیکن ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تمھیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آکر خط لکھوں گا۔" (اردوی: ۱۱۱)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے محولہ بالا "سطریں" چار پانچ گویا اس سے ایک دو دن قبل نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ سوء اتفاق سے ان سطور والا عریضہ مثل میں موجود نہیں۔ البتہ نواب صاحب کا جواب شامل ہے القاب و آداب کے بعد ارشاد فرمایا ہے "...... منشفقا ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ برائے مصارف تشریف فرمائی سامی برائے ملازمت جناب مستطاب معظم الیہم معطوف رقیمۂ الوداد ہذا مرسل خدمت شریف است۔"
یہ فرمان ۱۱ مارچ سنہ ۶۳ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ میرزا صاحب کے عریضے میں اسی کا حوالہ ہے۔ اصل عریضے کے جواب میں۔ نواب فردوس مکاں نے ۱۹ مارچ کو تحریر فرمایا: "...... جو کچھ خط نواب صاحب کمشنر بہادر سے عدم حصول شرف ملازمت جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہم کا بمقام انبالے مستنبط ہے، اس واسطے تشریف لیجانا آپ کا انبالے کو بلا استجازت ضرور معلوم نہیں ہوتا۔ آئندہ جو رائے زرین آپ کی اس خصوص میں مقتضی ہو اور خط مسطور بجنسہ واپس بھیجا جاتا ہے ......"

۱) قصیدۂ مذکور کے لیے مثنوی ابر گہربار ص ۳۵۔ اکمل المطابع، دہلی، سنہ ۱۲۸۰ھ ملاحظہ ہو

(۳) میرزا صاحب کا یہ جملہ غمازی کرتا ہے کہ انھیں لفٹنٹ گورنر اور گورنر جنرل کے میر منشی دونوں سے بحالی دربار کی اطلاع سُن لینے کے بعد بھی یقین نہیں ہوا تھا، جس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھیں بحالی کی تحریری اطلاع نہیں دی گئی تھی، ورنہ وہ ذرا ذرا سی بات پر ناامید نہ ہوتے۔

صفحہ ۲۶

(۱) صاحب سکرتر بہادر کے محولہ بالا خط کی نقل حسب ذیل ہے:

نقل خط جناب صاحب سکرتر بہادر

سرنامہ

درشہر دہلی

خانصاحب بسیار مہربان دوستان، مرزا اسد اللہ خاں، سلمہ اللہ تعالیٰ.

خط بر کاغذ افشاں:

خانصاحب بسیار مہربان دوستان سلامت

قصیدہ باآب و تاب در مدحت [illegible] مستطاب معلی القاب لارڈ بہادر، دام اقبالہ، وصول گردید، و برضا و ادب آں مہربان آنچہ در جبلّت عقیدت ایشان تابی افزود، و ارگرانمایہ گوہرہائی بحر فکر یکتا سخنور معنی پرور، کہ گنج برگنج نہادہ بود، از نظر قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ اطرب برای خاطر ہمایون ایشان گشت۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید زدستخط انگریزی) مرقوم ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء۔

یہاں یہ امر قابل اظہار ہے کہ میرزا صاحب کے اس روحانی سرور کے حصول میں اُن کے ایک جسمانی عارضے نے خلل اندازی کی۔ ۲ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں: "رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی" (اردوی: ۱۵۲) بعد ازاں ۳ مئی کو شیو نرائن کو لکھا ہے ". . . اس پھوڑے کا برا ہو! انبالے نہ جاسکا" (ایضاً: ۳۸۴) تفتہ کو ایک غیر مورخہ خط میں اطلاع دی ہے "لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا، اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا بیمار ہوں۔ ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے"۔ (ایضاً ۶۸ لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء)

(۲) آموں کی بہنگیاں ۲۹ جون سنہ ۱۸۶۳ء کو یہاں سے روانہ کی گئی تھیں۔

صفحہ ۲۷

(۱) حسین علی خاں کے لئے دیباچے کی بحث "خاندان" بھی ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کا املا (بالکل) لکھا ہے۔

(۳) نواب فردوس مکاں اس سال عارضہ سرطان میں مبتلا ہو کر مسلسل چھ ماہ تک علیل رہے

میرزا صاحب سے اُن کے تعلقات شاگردانہ اور کریمانہ تھے۔ جب انھیں علالت کی اطلاع ملی، تو بہت متردد ہوئے اور بذریعہ عریضۂ ہٰذا حقیقتِ مرض سے آگاہ کرنے کی درخواست کی۔ مثل میں اس عریضے کا جواب موجود نہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً شدتِ مرض کے سبب جواب میں تاخیر ہوئی، اور جب اس عرصے میں میرزا صاحب کا آیندہ خط بھی موصول ہوگیا، تو دونوں کے جواب میں مرض کی حقیقت سے انھیں اطلاع دی گئی۔

صفحہ ۲۸

(۱) اصل میں یہ لفظ ٹھہرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اسے صرف ایک ہائی ساکن کے ساتھ بولتے تھے۔

(۲) یا تو عبارت یوں ہونا چاہیے: "اس خط کا جواب آنے کی مدت سے پہلے"، اور یا "اس خط کے جواب کے آنے کی مدت سے پہلے"۔ بظاہر یہاں سہو قلم نظر آتا ہے۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "مشفقا! اب فضل الٰہی سے کچھوڑہ لاحقہ میں بہت تخفیف اور قریب الاندمال کی ہے"۔ عریضۂ ۳۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۲۶ نومبر کو موصول ہوا

صفحہ ۲۹

(۱) اشعار مذکور کے متعلق عریضے کے لفافے پر نوٹ ہے: "حسب الحکم تاریخ نزد مولوی امیر احمد صاحب فرستادہ شد یکم دسمبر ۱۸۶۴ء"۔ امیر مینائی مرحوم نے انتخاب یادگار (ص ۲۵) میں تہنیت غسل صحت کے نام سے یہ شعر درج کیے ہیں۔

دانم شنیدۂ کہ در اقصای مغربست	سرچشمۂ کہ خضر شد از وی بقا پذیر
جوی بریدہ اند درواں کردہ اند آب	حمام را بحوض ازاں فرخ آب گیر
ہنگام شب کہ ریزد ہمی باشد آفتاب	از تابِ مہر گرم شد آں آب ناگزیر
حمام حوض بنگر و گل جاشن آسماں	واں راسفید کردہ فروغ مہ منیر
آمد برای غسل بہ گرما بہ اندر دل	مانند معنی کہ دہر روی در ضمیر
اینک فراغ واحز بنگ و خجستہ روز	پیدا است زیں سہ لفظ سنہ تاریخ دلپذیر

"سید چلی"، ص ۱۵، طبع دہلی ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں ان کی بجائے ۲۶ شعر کا ایک قصیدہ طبع ہوا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا صاحب نے ان میں سے سات شعر چن کر نواب فردوس مکاں کے حضور میں بھیجے تھے۔ نواب صاحب نے اس قطعے کی تعریف میں حسب ذیل گرامی نامہ ۲۴ شعبان ۱۲۸۱ھ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کو تحریر فرمایا:

"ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارکباد کا جو آپ نے بھیجا ہے، وہ پہنچا۔ اس کے آنے سے سرور صحت دوبالا ہوگیا۔ ایسی نظم، ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں! حقا! کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے۔ جس کمال کو دیکھیے، قسم میں آپ کی ذات فرد کامل ہے۔ فی الحقیقت ہم نے اس مرض میں بڑی تکلیف اٹھائی۔ بہت ایذا پائی۔ اللہ نے بڑا فضل فرمایا۔ دوستوں کی دعا کو قبول کیا۔ شفا حاصل ہوگئی ہے

اندک از خم اندمال ہونے کو باقی ہے۔ غالب ہے کہ دس بارہ دن میں مرہم لگانا موقوف ہو جائے۔ آپ کا ہدیہ رسالہ اکثر نقل محفل رہتا ہے جو سنتا ہے جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں، ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے۔ تب کہیں ایک شخص اس کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ اللہم بصحت وعافیت طول عمر عطا کرے، اور تا دیر گاہ اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفید ہو کریں۔ باقی خیریت۔"

صفحہ ۳۰

(۱) یہ انگریزی لفظ "کیمپ" سے بنایا گیا ہے۔ کیمپ کے معنی ہیں پڑاؤ۔ بعض پرانے بزرگ کمبو بھی بولتے اور لکھتے تھے۔

(۲) اصل: ہر یک۔ لیکن یہ سہو قلم ہے۔

صفحہ ۳۱

(۱) میرزا صاحب نے "تونگر" لکھا ہے۔

(۲) اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ میرزا صاحب علم نجوم کے عالم تھے۔ انھوں نے خود سرور ہروی کو لکھا ہے: "... تحویل آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۲۱ اور کبھی ۲۳ بھی آ پڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں رہا طالع وقت تحویل درست کرنا بے کتب فن اور بے علم ممکن نہیں۔ میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں۔"
(اردوی لاہور ایڈیشن: ۱۰۲)

(۳) میرزا صاحب نے یہاں ہمزہ لکھا ہے۔

صفحہ ۳۲

(۱) میرزا صاحب نے ہمزہ لکھا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "ہڈلناگ" لکھ دیا ہے۔

(۳) قطعہ تاریخ غسل عریضہ (۳۹) کے حاشیہ میں درج کیا جا چکا ہے۔ قصیدہ تہنیت جو منشی سیل چند کے نام کے خط مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے مطابق، شعبان سنہ ۱۲۸۱ھ (جنوری سنہ ۶۵ء) اور ۲۵ رجب ۱۲۸۱ (۲۵ دسمبر سنہ ۶۴ء) کے درمیان لکھا گیا تھا، شامل نہیں ہے۔ لیکن اردو دیوان غالب مع شرح نظامی، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۲ء کے صفحات ۳۴۴۔ ۳۴۷ پر ایک قصیدہ پایا جاتا ہے، جو نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم، جاگیردار ریاست لوہارو نے رسالہ کمال، دہلی کو حاصل ہوا تھا اور اس کی اشاعت جنوری سنہ ۱۹۱۰ء سے مولانا نظامی نے نقل کیا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہ قصیدہ نواب خلد آشیاں کے غسل صحت کی تہنیت میں لکھا گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ میرزا غالب کا محولہ بالا قصیدہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں جشن کے موقع پر عید۔ نوروز اور ہولی کا جمع ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ اور امیر مینائی کے قطعہ تاریخ (انتخاب یادگار: ۵۰، و مراۃ الغیب: ۳۴۰، مطبع نولکشور، کانپور سنہ ۱۹۰۰ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ تہواروں کا یہ اجتماع نواب فردوس مکان کے غسل صحت کے وقت ہوا تھا۔ ان کے قطعے کا آخری مصرعہ ہے: "تھا عید کا، نوروز کا دن، روز صحت ہے۔"

میرزا صاحب کا قصیدہ حسب ذیل ہے

مرحبا سال فرخی آئیں
عید شوال و ماہ فروردیں

شب و روز افتخار لیل و نہار
مہ و سال، اشرف شہور و سنیں

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کی
جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں

شہر میں کو بکو عبیر و گلال
باغ میں سو بسو گل و نسریں

شہر گویا نمونۂ گلزار
باغ گویا نگارخانۂ چیں

تین تیوہار اور ایسے خوب
جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
منعقد محفل نشاط قریں

محفل غسل صحت نواب
رونق افزای مسند تمکیں

بزمگہ میں، امیر شاہ نشاں
رزمگہ میں حریف شیر کمیں

پیشگاہ حضور، شوکت و جاہ
خیرخواہ جناب، دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ
جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوار قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائی سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزم سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروی زمیں

انجمن چرخ، گوہر آگیں فرش
نور سے، ماہ ساغر سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالائے سطح چرخ بریں

وہ نظرگاہ اہل وہم و خیال
یہ ضیابخش چشم اہل یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے
ژالہ آسا بچھے ہیں در ثمیں

نغمہ مطربان زہرہ نوا
جلوہ لولیان ماہ جبیں

اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مطلوب
یاں وہ دیکھا بچشم صورت بیں

سرور دہر فرخ ہوا جو سوار
بہ کمال تجمل و تزئیں

سبزہ جا جا کہ ہے پری توسن
اور یاں پری کا ہے دامن زیں

نقش سم سمند سے یک سر
بن گیا دشت دامن گلچیں

فوج کی گرد راہ مشک فشاں
رہروؤں کے مشام عطرآگیں

بسکہ بخشی ہے فوج کو عشرت
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکب خاص یوں زمیں پر تھا
جس طرح ہے سپہر پر پرویں

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
ران پر داغ تازہ دے کے وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیب سریں

بندہ پرور، ثنا طرازی سے
مدعا عرض فن شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا منھ!
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب کہ ضعف پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی خدا کی پناہ — دست خالی و خاطر غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا — ہے قلم کی جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے — غالب عاجز نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں — تم رہو زندہ جاوداں آمیں

دیوان غالب اُردو کے طاہر ایڈیشن میں بھی یہ قصیدہ شائع ہو چکا ہے۔

صفحہ ۳۳

(۱) اس نثر کی رسید میں ۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۳ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا۔ "نثر نثرہ نثار آپ کی ائی۔ جشن صحت کی مسرت بڑھائی۔ زبان خامہ کو مجال صفت نہیں۔ خامۂ زبان کو یارائے مدحت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ آپ کی ذات ہر کمال میں فرد کامل ہے ہر فقرے میں نوعت سحبانی حاصل ہے۔ انصاف کی تو یہ بات ہے کہ یہ تحریر نہیں کرامات ہے۔ اس جشن میں اگرچہ بظاہر آپ شریک نہیں ہوئے، مگر میرے نزدیک شریک غالب ہے۔ اللہ تعالےٰ صحت و قوت عطا فرمائے۔ مشتاقوں کو لطف مجالست ہاتھ آئے۔ وست۔ عالمذہے۔ نوید صحت کی طبیعت آرزو مند ہے۔ حال اپنا اکثر لکھتے رہیے۔ زیادہ شوق ہے" میرزا صاحب کے خط کے لفافے پر امیر مینائی نے لکھا ہے: "بندہ نواز منشی سیلچند صاحب، حسب الامر سرکار مسودہ جواب خط مرزا نوشہ صاحب نوشتہ بخدمت میفرستم۔ حسب ضابطہ روانہ بایدفرمود۔ امیر فقیر"
اخبار الصنا دید (۲، ۱۲۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب تجویز صاحبزادہ سید کاظم علی خاں بہادر، عرف چھوٹے صاحب، باغ بے نظیر میں یہ جشن منایا گیا تھا۔

صفحہ ۳۴

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے

صفحہ ۳۶

(۱) ۲۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن نصف النہار کے وقت نواب فردوس مکاں نے انتقال کیا۔ یہ خبر شدہ شدہ دلی پہنچی تو میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے نام ۲۷ ماہ اپریل کو ایک عریضہ لکھا۔ اصل تحریر مثل میں موجود نہیں، تفتہ کے نام کے مکتوب سے جو ۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عریضہ تعزیت وفات اور تہنیت جلوس پر مشتمل تھا۔ فرماتے ہیں: رامپور سے اپریل کے مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آ گیا۔ آئندہ جو خدا چاہے۔ (اردوی: ۳۵۹ لاہور ایڈیشن، سنہ ۱۹۲۲ء) نواب خلد آشیاں نے یکم مئی کو اس عریضے کے جواب میں تحریر فرمایا" . . صحیفۂ شریفہ مورخہ ۲۷ ماہ گذشتہ اسمی مخلص وصول الطاف آورد و بما فیہا مطلع نمود۔ مشفقا! آنچہ متاہر آں کرم فرما رعہد نواب صاحب قبلہ فردوس مکاں مقرر است، انشاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری ماند حسب ضابطہ بنامی خدمت رسیدہ خواہد ماند"۔ اس کے بعد سرکار نے ماہ اپریل کی تنخواہ کی ہنڈوی کا ذکر کیا ہے۔ میرزا صاحب کا عریضہ اسی فرمان کی رسید ہے۔

(۲) یہ رباعی جدا ورق پر لکھ کر میرزا صاحب نے مکتوب ۵۴ کے ساتھ منسلک کر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۷ مئی کو بکرعید ہوئی تھی۔

(۳) قصیدہ تہنیت متن میں نہیں پایا جاتا۔ یہاں عود ہندی (ص ۱۷۱) اور سبد چین (ص ۱۲) سے نقل کیا جاتا ہے۔

تجلیی که ز موسیٰ ربود هوش بطور — بشکل کلب علی خان دگر نمود ظهور

خجسته سرور سلطان شکوه و نازم — که رشک بر کلهش دارد افسر فغفور

هوای لطف وی، از جان تحیر سوزش — نگاه قهر وی، از روی مه رباید نور

دم نگارش وصف کلام شیرینش — چو خیل مور، دود بر ورق حروف سطور

فضای رزمگهش، شاه راه قهر و غضب — بساط بزمگهش، کارگاه سور و سرور

بخوان شرع نهیں، همنوالهٔ شبلی — به بزم عشق نهیں، هم پیالهٔ منصور

زروی رابطهٔ حسن، ماهتاب جمال — بحسب ضابطهٔ جاه، آفتاب ظهور

بحکم مرتبه او حاکم و فلک محکوم — زراه قاعده، شرع آمر است او مامور

چو آب جل روانی که ایستد بمغاک — بود همیشه به فنجان وی شراب طهور

زهی وزیر وفی شهریار دانادل! — تو شاه کشور حسن و خرد ترا دستور

بنای منظر جاه ترا، زحل معمار — ثوابت کرهٔ چرخ هشتمیں مزدور

ثناگر تو سکندر به بارگاه جلال — تفاخر تو ارسطو بدرسگاه شعور

برای بزم نشاط تو شمع چون ریزند ق — نه پیه گاو بکار آورند نی کافور

ز فیض نسبت خلق تو، عنبر سارا — بجای موم برآید ز خانهٔ زنبور

بدین خرام و بدین قامت و بدین رفتار ق — ز بهر فاتحه آئی اگر بسوی قبور

جهان جانی و جان جهان، عجب نبود — که از درود تو هر مرده رقص اندر گور

بپیشگاه تو، زانو همی زند انصاف ق — که ای برحم و کرم در جهانیان مشهور

در انتقام کشی شیوهٔ کرم مگزار — برار کام دل بدسگال از ساطور

توئی بعقل فزاینده عروج علوم — توئی بعلم کشاینده عقود صدور

صریر خامهٔ من بین که میرباید دل — چنانکه از لب داؤد استماع زبور

سواد صفحهٔ من بین و تابش معنی — عیان چو شمع فروزنده در شب دیجور

امیر زنده دل، آن والی ولایت نظم — به گنج خانهٔ گنجینه طامیش گنجور

غروب مهر و طلوع مه ده هفته بود — رسیدن تو بدین اوج بعد آن مغفور

چو او بزیر زمیں رفت و آں ولایت یافت — تو باش والی روی زمیں فزون دهور

به انجمن نرسیدم ز ناتوانائی۔ — دلی بعرض ثنا و دعا نیم معذور

بخاک پای تو اگر دستگاه داشتمی — نبودمی بنعیم دوری از تو صبور

من آں کسم که از افراط ورزش اخلاص — بغیبت است مرا دعوی دوام حضور

توئی رحیم دل و من سقیم، دوری به — مباد، رنجه شوی از نظارهٔ رنجور

کنم بدست تهی نذر کیسهٔ دلاک — دلی بسینه بسی تنگ تر ز دیدهٔ مور

کمی نہ باد کرم از سَما؛ بلا تشبیہ — زکرد کار تو در تمنا دز خندہ دغرور
نظر بحستگی و پیری دہتیدستی — قبول کردن نسبام من خوش است زدور
شعار غالب آزادہ جز دعا بود — کہ باد سعی و مآثری در دعا مشکور
بہ دہر تا بود آیین کہ در نوا آرند — رباب و بربط و قانون و نی بجشن و سرور
بہ بزم عیش تو ناہید باد زمزمہ سنج — نسیم عطر فردوس از شمیم طرۂ حور
محب ز لطف تو بالندہ، چوں نوا رصبا — عدو ز بیم تو نالندہ، چوں خر طنبور

میں نے اس قصیدے کا مقابلہ ایک قلمی ورق سے بھی کیا، جو حکیم رامپوری مرحوم کے پاس تھا۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ یہ وہی پرچہ کا غذ ہے جس کو خود غالب نے میر عوض علی خوشنویس کو بھیجا تھا، تاکہ سرکار میں پیش کرنے کے لئے اس کی خوشخط نقل کر دیں۔ لیکن اس کا خط میرزا صاحب کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں یہ گمان کرتا ہوں کہ کسی نے رامپور بھیجی ہوئی اصل سے نقل کیا ہے۔ جو نکہ اس قسم کے نوادرات حکیم مرحوم کو میر بھائی کے یہاں سے دستیاب ہوئے تھے، کیا عجب ہے کہ یہ نقل انہیں کے لئے تیار کی گئی ہو۔ اس میں جزئی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً مصرع "امیر زندہ دل آں والی ولایت نظم"، کو "امیر قلمرو نظم" کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ قصیدۂ مذکور میرزا صاحب ہی کے مسودے کی نقل ہے، ورنہ دوسرا شخص شعر میں اتنا تغیر کبھی نہ کرتا۔

نواب خلد آشیاں نے ۱۶ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۱ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو اس قصیدے کے متعلق تحریر فرمایا: "۔۔۔ دو قطعہ سامی صحیفہ لطف آگیں، اول مع قصیدہ تہنیت مسند نشینی راقم بر ریاست موروثی ملک رامپور و ثانی مع سلام مسنونہ تعزیت جناب مغفرت مآب نواب صاحب دخلد فردوس مکان در اسعد از منہ آمیں ریز دامن وصول فرحت شمول گشتہ ۔۔۔ حبذا قصیدہ کمالی مدحت مضامین بر جستہ و معانی دل نشستہ اش را رستہ برزم گنیدن آب در بانکبیل ہمیون است و شمہ از توصیف فصاحت و بلاغت آں سفینہ تحریر در آوردن ثوابت و سیارہ را بہ پنج انگشت شمردن ۔۔۔ در خیال ثانی نواب مرزا اعظم سامی بایں طرف مسموع گشتہ، موجب کمال مسرتہا ست، چہ اکر راقم بہ شستی ملاقات شریف است و اد تعالیٰ شب ہلیدی فراق بزودی ہر چہ تمامتر بایام وصال مبدل گرداند۔"

یہ خط میرزا صاحب کو ۱۷ جون کو موصول ہوا۔ ۱۸ جون کو انھوں نے اس کا جواب تحریر کیا جو نمبر (۲۹) پر درج ہے۔

(۴) میرزا صاحب نے "ساکھ" لکھا ہے۔

(۵) اس شعر کو میرزا صاحب نے اپنے دو شعروں کے ایک ایک مصرع سے بنا لیا ہے۔ وہ دونوں شعر پچھلے اور آیندہ عریضوں میں بار بار دہرائے جا چکے ہیں۔

(۶) لفافے پر ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۵ء درج ہے اور اس کی پشت پر لکھا ہے: "دو خط در رسید قصیدہ وسلام مرسلہ نوشتہ شد و المرقوم ۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۳۱ مئی سنہ ۱۸۶۵ء"

صفحہ ۳۷

(۱) میرزا صاحب نے "اکھاڑ والے" لکھا ہے

(۲) میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے جود و کرم کے اس واقعے کا ذکر متعدد خطوں میں کیا ہے حکیم غلام رضا خاں کو لکھتے ہیں: "...... نواب صاحب حال بمقتضائے الولد سر لابیہ" حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر، بلکہ بعض شیوہ روش میں ان سے بہتر ہیں۔ بمجرد مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کیا، علی بخش خاں خانساماں کو بیس ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا۔۔۔۔" اردوی: ۴۵۲) تفتہ کے نام کے خط میں دقیق تفصیل کی ہے فرماتے ہیں "۔۔۔۔ نواب صاحب از روی صورت روح مجسم اور با عتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فنش کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی وصلا صرعرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ۔ عرض تا دی صیغہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی" (ایضا: ۲۹۸)

تخریب توپخانہ اور بخشش محصول غلہ کا ذکر اخبار الصادید (۲، ۱۷۹) میں بھی کیا گیا ہے۔

(۳) وا بہ شا بگال ہو گیا ہے۔

(۴) اصل: رداد

(۵) اصل: تصبیرہ۔ لیکن ازروی قواعد یہاں بصیغہ جمع استعمال کرنا ضروری تھا۔ بنا بریں اسے سہو قلم پر محمول کر کے متن میں اصلاح کر دی گئی ہے۔

(۶) یہ رسید عریضہ سابق کے ہمراہ بھیجی گئی تھی، اس لئے لفافے کی عبارت دونوں سے متعلق شمار کی جائے

صفحہ ۳۸

(۱) محولہ بالا فرمان کا اقتباس عریضہ (۳۷) کے حاشیے میں دیا جا چکا ہے

(۲) یہ قصیدہ عریضہ (۴۶) کے حاشیہ میں درج ہو چکا ہے۔

(۳) کلیات فارسی کے رامپوری نسخے میں اسکا اندراج نہیں ہے، حالانکہ جوابی فرمان، مورخہ ۱۵ جولائی، میں سرکار نے اس کا وعدہ فرما لیا تھا۔

(۴) اصل: بوڑھے مگر اس لفظ کو ۹ جون سنہ ۶۶ء کے عریضے کے ساتھ والی غزل میں "بوڑھا" رڑے کے سا لکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ آخر میں میرزا صاحب نے تلفظ اور املا دونوں بدل لئے تھے

(۵) سفر کی تفصیل کے لئے دیباچہ ملاحظہ ہو۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ میرزا صاحب ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء کو دلی سے عازم رامپور ہوئے اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو واپس دلی پہنچے (اردوی: ۳۴۴)

(۶) نواب یمین الدولہ۔ یہ ملک محمد علی خاں بہادر صولت جنگ ریاست ٹونک کے نواب

تھے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء میں گدی پر بیٹھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۷ء میں لاوا میں ٹھاکر دل کا قتل عام کرانے کے الزام میں حکومت ہند نے انھیں معزول کر دیا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں ریاست پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے زیر انتظام آگئی، اور حافظ ابراہیم علی خاں بہادر نواب بنا دیے گئے۔ نواب امین الدولہ بنارس چلے گئے، اور ۲۵ سال تک مقیم رہنے کے بعد ۱۶ صفر ۱۳۱۳ھ (۸ اگست سنہ ۱۸۹۵ء) کو بنارس میں انتقال کیا۔ (آثار راقم؛ ۲۳۹۔ نیز ملاحظہ ہو مکتوب ۱۳۰ کا حاشیہ ۶۔)

(۷) احمد شاہ درانی ضلع ہرات کا باشندہ اور ابدالی نامی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ نادر شاہ اسے ایران پکڑ لے گیا، اور اپنی خدمت گرز برداری پر مقرر کیا۔ اس نے رفتہ رفتہ فوج کے بڑے عہدے تک ترقی کر لی۔ ۱۲ مئی سنہ ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ کی وفات پر بغاوت کر دی، اور تھوڑے عرصہ میں افغانستان، سندھ اور لاہور کا بادشاہ بن بیٹھا۔ احمد شاہ نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے۔ لیکن اس کی شاندار ترین جنگ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے عظیم الشان لشکر سے واقع ہوئی، جس میں احمد شاہ کامیاب ہوا اور بعد فتح شاہ عالم کو تخت و تاج ہند سونپ کر افغانستان چلا گیا۔ احمد شاہ نے ۲۳ سال حکومت کر کے سنہ ۱۱۸۶ھ (سنہ ۱۷۷۲ء) میں ۵۰ سال کی عمر میں وفات پائی (مفتاح التواریخ، ۲۵۰)

(۸) جدِ امجد سے نواب سید غلام محمد خاں بہادر مراد ہیں۔ احمد شاہ کے عطا کردہ خطابات کے سلسلے میں اخبار الصنادید (۱: ۶۶، ۷۱) ملاحظہ ہو۔

(۹) میرزا صاحب کے اس خیر خواہانہ عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "۔۔۔ استعمال الفاظ خطاب دستور ایں ریاست نبودہ است حسب الترقیم قصیدہ و سلام مذکور در دیوانہا مندرج کنانیدہ خواہد شد۔۔۔ ۲ صفر سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۵ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء" میرزا صاحب نے اس فرمان کے جواب میں حسب ذیل قطعہ لکھ کر ارسال کیا (مہر نیمروز، ص ۸۴)

ہزار و دو صد و ہشتاد و دو شمار کنید	بحسب ضابطہ از ہجرت رسول اللہ
چہار شنبہ آخر بود ز ماہ صفر	کہ می در آدرم ایں قطعہ را بنظم بگاہ
سفیدۂ سحری کاغذ است و من راقم	سواد صفحہ نمط، روی بدسگال سیاہ
ہمی نویسم و دو فتے نوشتنم باشد	دلی رہیم لبالب، چو لب بعذر گناہ
خدا کند کہ مشرف شود چو ایں قرطاس	بہ پیش مسند عالی زہے زہے درگاہ
امیر کلب علی خاں بہادر از رہ لطف	بسوی عالمِ خوبیں جگر کنند نگاہ
کہ ایں فلک زدہ گر عرض کرد مصلحتی	بزعم بندہ ز اخلاص بود، ور ناگاہ
خلاف طبع مبارک فتاد آں تقریر	بسی خطا رود از بندگان دولتخواہ
تو بادشاہ و شہنشاہ تاجدار فرنگ	خطاب می طلبد بادشہ ز شاہنشاہ

چو رائی من نپذیری، ز جرم من بگذر
بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔"

صفحہ ۴۰

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۶ اگست ۱۸۶۵ء) کو تحریر فرمایا: "... صحیفۂ لطف آگیں بخلاصہ کی بارش باران رحمت در آں نواح و استدراک خیریت مزاج راقم مع قطعہ دعائیہ غازہ آرای چہرہ وصول نشاط شمول گردیدہ بر فیہا مطلع نمود و در ذیل قطعہ مذکورانہ مزید الطاف فرمائیہا تصور رسیدہ۔ مشفقا! سابق ازیں فی الحقیقہ طبیعت راقم بعارضۂ تخمر چیزی کسلمند شدہ بود، لیکن حالات بعنایت الٰہی مزاج مخلص خوش و خرم است۔ ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ برای آں شفیق، کہ بتقریب صحت از عارضۂ لاحقہ بدیگر صاحبان مستحقین نیز ازیں سرکار عنایت شدہ بود، معطوف رقیمۂ الوداد ہذا بطریق عنایات سمت تبلیغ یافتہ..."
میرزا صاحب کا یہ قطعہ دعائیہ "غالب نامہ" کے دوسرے ایڈیشن میں محمد اکرام صاحب نے چھاپ دیا ہے۔

صفحہ ۴۱

(۱) میرزا صاحب نے اس جگہ کے علاوہ مکتوب نمبر ۹۰ میں بھی نون غنہ لکھا ہے۔
(۲) اس سے نامۂ غالب مراد ہے۔ میرزا صاحب نے فارسی لغت کی مشہور کتاب "برہان قاطع" کے بعض اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ مسمیٰ بہ "قاطع برہان" اوائل ۱۸۵۹ء میں تصنیف کر کے نواب فردوس مکاں کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس میں رد و قدح کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا تھا، وہ غیر عالمانہ ہی نہیں، کسی قدر سوقیانہ بھی تھا۔ چنانچہ مفتی محمد عباس لکھنوی نے بھی جو میرزا صاحب کے حامیوں میں تھے، ان کے ایک خط کے جواب میں قاطع برہان نام کی درستی و لطف ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا: "... معنی صاف ہیں، معترض نا انصاف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے نام پیدا ہے، کہ اس نے برہان قاطع کو الٹا ہے۔ ان دونوں کا ایک نمط پر ہونا جای تامل و غور ہے۔ ظاہرا اس کا مطلب اور آپ کا مقصد اور ہے۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آتے ہیں اس نے غالباً معنی ثانی مراد لیے ہیں اور آپ معنی اول استعمال میں لائے ہیں۔ بہر صورت برہان کی طرف ظاہرہ قاطع کی اضافت ہے، اور اس ترکیب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں کچھ شک و ریب نہیں، کہ ایہام میں حسن ہے، کچھ عیب نہیں۔ لیکن تقصیر معاف ہے

ظرافت نہ کرنی تھی، یہ کیا کیا ۔۔۔ درشتی نے آفت کو برپا کیا

اضعف الناس، عباس"۔ (بیاض قلمی مملوکہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب) کچھ تو ہندوستانی تقلید کے دلدادہ تھے، اور کچھ اس کا انداز تحریر دل آزار تھا، کتاب کے شائع ہوتے ہی مخالفت کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ برہان کے حامیوں نے اس کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک کا نام "ساطع برہان" تھا۔ اس کے مصنف کے متعلق میرزا صاحب میاں سیاح کو لکھتے ہیں: "وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے۔ وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملانے مکتب دار کا خبط ہے... رحیم بیگ اس کا نام ہے۔ میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے" (اردوی، ۲۷ و ۳۱)

شاکر کو لکھا ہے: "رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہموطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اور دل سے مدد لیتا ہے۔ اہل دلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وای اس ہیچ در پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہوا" (عود: ۱۶۱) اس کتاب کے جواب میں میرزا صاحب نے "نامۂ غالب" لکھا، اور اس کو ۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۵ء سے قبل طبع کرا کے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں بطریق ارمغان پیش کیا۔ یہ رسالہ عود ہندی (ص ۱۴۱-۱۵۵) میں بھی چھپ چکا ہے۔ یہ رسالہ جداگانہ مطبوعہ نسخے کی کوئی جلد کتابخانے میں موجود نہیں اور نہ کہیں بازار میں ملتی ہے۔ جناب مختار الدین احمد آرزو صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ اسے مرتب کر کے عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔

(۳) شاہ عباس ثانی، صفوی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا، اس نے سنہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) سے سنہ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) تک ایران پر حکومت کی۔ میرزا صاحب کا یہ بیان کہ اس بادشاہ کے عہد حکومت میں ایرانیوں نے داستان امیر حمزہ بنائی، کسی طرح درست نہیں۔ آئین اکبری (۱:۱۰۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کی طرح رموز حمزہ کا بھی ایک خوشخط اور مصور نسخہ ۱۲ دفتروں میں تیار کرایا تھا۔ آئین کا سال تالیف مورخ کے بیان کے مطابق ۱۵۹۰ء (۹۹۸ھ) ہے۔ خان عبدالمقتدر مرحوم نے کتابخانۂ بانکی پور پٹنہ (ج ۷، ۹۴) میں لکھا ہے کہ آئین اکبری، اکبرنامہ کی تیسری جلد ہے، اور اکبرنامہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۶ء) میں تمام ہوا تھا۔ بعد ازاں سنہ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۹ء) تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔

شاہ عباس ثانی کی پیدائش کا سنہ ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) ہے۔ مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہے کہ شاہ عباس کی پیدائش سے ۳۹ یا ۴۵ برس پہلے رموز حمزہ، اکبر کے کتابخانے میں تیار کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی پرانے نسخے ہی کی نقل ہو گی۔ یہ تو رہا ہندوستان کا معاملہ۔ کتابخانہ بانکی پور میں ایک کتاب بنام زبدۃ الرموز محفوظ ہے۔ اس کا مصنف حاجی قصہ خواں ہمدانی دیباچے میں لکھتا ہے کہ میں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں عراق سے حیدرآباد پہنچا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ از سنہ ۱۰۲۰-۱۰۸۳ھ = ۱۶۱۱-۱۶۷۲ء کے دربار میں داخل ہوا۔ میں اپنے ساتھ رموز حمزہ کے کئی نسخے لایا تھا۔ بادشاہ کے حضور میں انھیں پیش کیا۔ تو حکم ملا کہ ان کا خلاصہ تیار کر دو۔ اس حکم کی تعمیل میں یہ کتاب زبدۃ الرموز مرتب کی ہے (فہرست کتابخانۂ بانکی پور: ۱۴۹۸)۔ اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عباس ثانی کی پیدائش سے ۲۰ برس پہلے یہ کتاب عراق سے دکن میں پہنچ چکی تھی اور چونکہ کئی نسخے دکن میں لائے گئے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا قرین عقل ہے کہ عرصے سے ایران و عراق میں اس کا رواج تھا۔

صفحہ ۴۲

(۲) اس قصیدے کے چند اشعار تذکرۂ انتخاب یادگار میں بذیل ذکر غالب اور پورا قصیدہ سبد چین (ص ۱۸) میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس نام کا املا اور تلفظ دونوں غلط لکھے ہیں۔ یہ نام "عمرو" بسکون میم در بادۂ واؤ لبعد راہے میں نے ازراہ احتیاط اعراب کا اضافہ کر دیا ہے تاکہ "عمر" بضم میم و فتح عین سے التباس دور ہو جائے۔

(۴) "سبد چین" کے دونوں ایڈیشنوں میں "عنطلیہ" ہے۔ اور یہی صحیح ہے، اس لیے کہ رموز حمزہ (ج ۲، جزء ۸، طبع ایران ۱۲۷۸ھ) میں بھی ہر جگہ عنطلیہ ہی پایا جاتا ہے۔

صفحہ ۴۳

(۱) بد مثل خوشا، بسیار بد۔ (منہ)

(۲) ہمارہ مخفف ہموارہ (منہ)

(۳) آدم ادباری، ادباریدن بمعنے ناخائیدہ فرد بردن ادبار صیغہ امر و در آخر تحتانی، مردم آزاری مثلہ (منہ)

(۴) میرزا صاحب نے یہ لفظ بضم الہا لکھا ہے۔ لیکن صحیح "اسپہبد" بفتح البا رہے۔

صفحہ ۴۴

(۱) فرد ہل بمعنی بگذار۔ از ینجا التزام موقوف است۔ (منہ)

(۲) گزیں بجای گزیدہ مستعمل اہل زبان۔ تمر بہ تحتانی مکسور و میم مضموم در ترکی فولاد را گویند و اسم شاہی است از اولاد النقوا۔ و اینکہ تیمور نو بسند، طرز املاست اعراب بالحرف (منہ)

صفحہ ۴۵

(۱) قرضخواہ کی جگہ قرضدار کا استعمال بے پڑھے لکھوں کی زبان پر آج بھی جاری ہے۔ میرزا صاحب جیسے مین میکھ نکالنے والے سے تعجب ہے کہ کس طرح اس کو جائز رکھا۔ چونکہ انہوں نے میر قربان علی بیگ سالک اور تفتہ کے نام کے خطوں میں بھی قرضخواہ کی جگہ قرضدار استعمال کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فصحا کی زبان پر بھی کبھی کبھی یہ غلط لفظ آجاتا تھا۔ ملاحظہ ہو، غالب: ۲۰۳، طبع ثانی و خطوط غالب: ۱۷۱۔

(۴) حکیم ببر علی خاں کے متعلق صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ یہ دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ ان کے بیٹے حکیم اسد علی خاں کا ذکر سخن شعرا (ص ۲۴۲) میں مضطر تخلص کے تحت کیا گیا ہے اور انہیں میرزا قربان علی بیگ سالک کا شاگرد لکھا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں حکیم ببر علی خاں بقید حیات تھے۔ ایک حکیم ببر علی خاں، حکیم کاظم علی خاں کے والد تھے۔ نوا بین العلاج (نمبر ۱۴۳ طب فارسی) کے آخری ورق پر ان کا نام ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دوسرے شخص جو اول اور نسخۂ مذکورۂ متن انہیں کا مرتبہ ہو۔

صفحہ ۴۶

(۱) یہاں کوئی ایک لفظ ساقط معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اس عریضے کے جواب میں ۶ ربیع الثانی سنہ ۸۲ھ (۲۹ اگست سنہ ۶۵ء) کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "سہ قطعہ مقادضۂ لطف آگین، اول مع قصیدۂ نادرہ کہ مضامین عالیش مملو بہزاران درر غرر معانی بود، وثانی مشعر رسید ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ وثالث محتوی بر نسخہ ہای معجون وغیرہ براہ محبت معنوی متواتر با ہمیں ریزگریان وصول نشاط شمول گشتہ ..... حالا مزاج راقم بوجوہ خوش وخورم است۔"

صفحہ ۴۷

(۱) سکندر زمانی بیگم، نواب خلد آشیاں کی اہلیہ کی وفات پر یہ خط اور قطعۂ تاریخ لکھا گیا ہے۔ ان بیگم کے والد صاحبزادہ سید امداد اللہ خاں ولد صاحبزادہ سید لفایت اللہ خاں ولد نواب نصر اللہ خاں بہادر تھے اور والدہ آفتاب بیگم بنت صاحبزادہ سید کریم اللہ خاں خلف نواب سید فیض اللہ خاں بہادر مغفور۔ سنہ ۱۲۶۲ ہجری میں ان کے ساتھ نواب خلد آشیاں کی شادی ہوئی۔ نواب سید مشتاق علی خاں بہادر، عرش آشیاں، انھیں کے بطن سے تھے۔ (انتخاب یادگار: ۲۲۵، واخبار الصنادید: ۲۰۴۳۰۲)

(۲) یہ قطعۂ تاریخ دوسرے ورق پر لکھ کر اس عریضے کے ساتھ ملفوف کیا گیا تھا۔ اب سبدِ چین میں بھی چھپ چکا ہے۔

(۳) استاد سے مراد قلندر بخش جرأت دہلوی ہے۔ اس کا مصرع تھا: "جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دن" میرزا صاحب نے پیارے کی جگہ حضرت کر دیا۔ یہی وہ تغیر لفظ ہے جس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

صفحہ ۴۸

(۱) یہ عریضہ میرزا صاحب نے رامپور سے لکھا ہے۔ اس زمانے میں نواب خلد آشیاں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ میرزا صاحب رضوان کو لکھتے ہیں: "آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمایشگاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔" (اردوی: ۳۲۰) حکیم غلام نجف خاں کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ نومبر کی صبح تک واپس تشریف نہیں لائے تھے، فرماتے ہیں: "نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے جشن جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" (ایضاً: ۲۳۱)

نواب خلد آشیاں نے ۱۰ نومبر کو اس خط کا جو جواب دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے خیریت مزاج معلوم کرنے کے لیے دو عریضے لکھے تھے ان میں سے آخری کے جواب میں سرکار نے تحریر فرمایا کہ: "عنقریب اتفاق مراجعت برامپور نمودہ"

(۲) صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے متعلق صاحب انتخاب یادگار (ص ۳۹۰۷) کہتے ہیں:

"نبیرۂ صاحبزادہ محمد ممتاز علی خاں ولد صاحبزادہ محمد اعجاز علی خاں ولد صاحبزادہ نیاز علی خاں

ولد صاحبزادہ حسن علی خاں ولد جناب مستطاب نواب محمد فیض اللہ خاں صاحب بہادر، عرش منزل، طاب ثراہم، ستائیس برس کا سن ہے۔ میر احمد علی رسا کے شاگرد ہیں۔ یہ صاحبزادے نہایت اہلبیت شعار ہیں، خوش خلق وخوش اطوار ہیں۔ یہ ان کا کلام ہے:

شوق ہر چند یہ کہتا تھا کہ بوسے لیجے — پر ترا نقشِ قدم مجھ سے مٹایا نہ گیا

صاحبزادے صاحب کو نواب سعیدالدین احمد خاں فاروقی کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ اس تقریب سے مرادآباد میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، اور وہیں انتقال کیا۔

(۳) نواب سعیدالدین احمد خاں، نواب محمدالدین احمد خاں کے بیٹے اور نواب مجیدالدین احمد خاں عرف نواب مجو خاں مرادآبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے آباء و اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی عصمت اللہ فاروقی، نواب عصمت اللہ خاں بہادر کے لقب سے مفتخر اور عہد عالمگیر میں مختلف صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے۔ خود نواب مجو خاں بھی بڑی جاگیر کے وارث تھے۔ غدر سنہ ۵۷ء میں بجرم بغاوت انھیں پھانسی دیدی گئی اور اس وقت سے اس خاندان پر زوال آگیا۔ مرادآباد میں اس خاندان کے اخلاف اب بھی موجود ہیں نواب سعیدالدین احمد خاں کی ایک تصنیف "لب لباب رمل" کتابخانہ ریاست میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ بڑے اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ خود مصنف نے تیار کرایا ہوگا۔ دیباچے میں مصنف نے اپنے خاندان کی ابتدائی تاریخ اور بعدازاں سنہ ۵۷ء میں اس کی بربادی پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے۔ نواب سعیدالدین احمد خاں نے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۳ھ، ۲ جنوری ۱۸۸۶ء اور ۸ جمادی الاولیٰ سنہ مذکورہ (۱۳ فروری سنہ مذکورہ) کے درمیان انتقال کیا۔

(۴) لارڈ ولیم بنٹنگ د   نے دیوانی عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے واسطے تین درجے مقرر کرائے تھے: (۱) صدر الصدور، اس کا مشاہرہ ۵ سو روپے تھا، اور دیوانی مقدمات میں ججوں کے برابر اختیارات دیئے گئے تھے، (۲) صدر امین، اس کا مشاہرہ دو سو سے تین سو روپے تک تھا۔ اور ہزار روپے تک مقدمات فیصل کرسکتا تھا، (۳) منصف، اس کا مشاہرہ سو روپے سے ڈیڑھ سو روپے تک تھا، اور تین سو روپے تک کے مقدمات فیصل کرنے کا اختیار تھا۔ منصفوں کی ترقی صدر امینی پر اور صدر امینوں کی ترقی صدر الصدوری پر ہوتی تھی۔ منصف کے لیے وکل کمیٹی کے سامنے امتحان دینا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ترقی کارگذاری کی عمدگی پر موقوف تھی۔ تاریخ ہندوستان، ذکاء اللہ ج ۳ ج ۲: ۷۹۶،

(۵) مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مرادآباد ولد مفتی ابوالحسن، بانس بریلی کے باشندے تھے، علم وفضل کے ساتھ شعرگوئی کا بھی شوق تھا اور اسیر تخلص کرتے تھے۔ سخن شعرا (ص ۲۷) میں ان کا یہ شعر درج ہے۔

اب حبس دوامی بھاگو گے کس سے اسیر — زلفوں میں کیوں پھنسا تھا یہی ہے سزائے دل

ان کی ایک فارسی تصنیف اصل الاصول کتابخانے میں محفوظ ہے۔ یہ نحو عربی کا ایک رسالہ ہے۔ جسے سنہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف، اور مطبع نظامی کانپور میں سنہ ۱۲..ھ میں

طبع کرایا تھا۔ ان کے فرزند مولوی نجم الحسن خاں کے مکتوب مورخہ ۲۶ اپریل ۱۸۷۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر الصدور تاریخ تحریر مکتوب سے ۵ سال قبل، تقریباً سنہ ۱۸۷۳ء میں، انتقال کر گئے تھے۔ ان کے برادر خورد مولوی حامد حسن خاں صاحب صدر الصدر فروری سنہ ۱۸۷۸ء میں فوت ہوئے ہیں۔

(۶) نواب مصطفیٰ خاں بہادر، فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر جہانگیرآباد کے جاگیردار اور بڑے صاحب علم و خوش گفتار شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ (اردوی: ۱۰۱) ابتداءً حکیم مومن خاں سے مشورۂ سخن رہا۔ ان کے انتقال کے بعد میرزا صاحب سے اصلاح لینے لگے۔ انہوں نے اردو شعرا کا ایک قابل استناد تذکرہ "گلشن بیخار" فارسی زبان میں تصنیف کرکے خود شائع کیا تھا۔ آشوب غدر میں شیفتہ کو ۷ سال کی سزا ہوئی لیکن آخر کار رہا ہو گئے۔ میرزا صاحب سے ان کے بہت مخلصانہ روابط تھے۔ جب میرزا صاحب قماربازی کے الزام میں قید کیے گئے، تو انہوں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ "حبسیہ" میں میرزا صاحب نے اس خلوص کا اس طرح اعتراف کیا ہے

خود چرا خون خورم از غم که به غمخواری من	رحمت حق به لباس بشر آمد، گوئی
خواجہ ہست دریں شہر که از پرسش وی	پایہ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خاں که دریں واقعہ غمخوار من است	گر بمیرم، چہ غم از مرگ، عزادار منست

شیفتہ نے ۶۳ سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں وفات پائی۔

(۷) میرزا صاحب کو یہ مصیبت رامپور سے واپسی کے وقت برداشت کرنا پڑی تھی۔ دیباچے میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۴۹

(۱) دراصل یہ قطعہ سفر کلکتہ کے سلسلے میں لکھا گیا تھا، چنانچہ رای چھج مل کھتری کے نام ایک فارسی خط میں (پنج آہنگ: ۱۰) چھپ بھی چکا ہے۔ لیکن وہاں بجائے "غلبۂ غم سے" "سطوت غم"، اور بجائے مصرع ثالث "گو نہ زندہ تا بہ بنارس رسیدہ ست" تحریر ہے۔

(۲) لفافے پر ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء تحریر ہے۔

(۳) نواب خلد آشیاں کو میرزا صاحب کے مصائب سفر کی روداد نواب مصطفیٰ خاں بہادر کی زبانی معلوم ہوئی، تو انھوں نے مرادآباد کے پتے پر میرزا صاحب کو تحریر فرمایا: "نواب صاحب مشفق مہربان، کرمفرمای مخلصاں، سلمہ اللہ تعالیٰ! بعد اشتیاق معلوم ہو کہ المسرت کہ متجاوز التحریر ہے، مشہود ضمیر مودت تخمیر کے ہو۔ زبانی نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مرادآباد میں کچھ طبیعت آپ کی علیل ہو گئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمال تردد کا ہوا۔ اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ حال خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔ اور اگر ہنوز طبیعت مائل باعتدال نہ ہو، اور آپ کا ارادہ قیام مرادآباد کا تا درستی ہو، تو آپ رام پور میں تشریف لائیے۔ یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا۔ فقط زیادہ جمعیت اور نشاط ہو۔ المرقوم ۱۷ شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق

۵ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء محمد کلب علی خاں "۔

مثل میں اصل فرمان موجود اور اس کے لفافے پر تحریر ہے کہ "خط ہذا ہرکارہ بر ندہ از مرادآباد بجہت تشریف فرما شدنِ مرزا نوشہ صاحب بہ دہلی واپس آورد۔ مرقوم ۱۲ شعبان سنہ ۸۲ھ"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کو فرمان موصول نہ ہوا۔ مگر اس عرصے میں ان کا عریضہ (۶۰) رامپور پہنچ گیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ اجنوری کو تحریر فرمایا: "جو کہ وقت اطلاع انحراف طبیعت آپ کے مرکز اعتدال سے بمقام مرادآباد رقیمۂ الوداد اس مضمون سے کہ اگر ارادہ قیام مرادآباد کا واسطے معالجے کے ہو تو رامپور کو معاودت کیجے، یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا۔ بدست سرکارہ کے بھیجا گیا تھا۔ لیکن آپ وہاں سے روانہ دہلی کے ہو گئے تھے ہرکارہ خط واپس لایا۔ اس روز سے کمال انتظار وصول مفاوضہ خیریت کا تھا۔ الحمدللہ کہ وصول نمیقہ لطف آگیں باعث اطمینان ہوا"۔ میرزا صاحب کا عریضہ (۶۱) اسی فرمان کا جواب ہے۔

صفحہ ۵۰

(۱) غلام نوخرید سے حسین علی خاں مراد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۲ جنوری کے عریضے کے بعد کوئی اور خط بھی لکھا تھا۔ جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کی استدعا کی گئی تھی مثل میں یہ خط اور اس کا جوابی فرمان دونوں موجود نہیں ہیں، اس لیے سوال و جواب کی نوعیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال موجودہ مراسلت میں یہ پہلا عریضہ ہے۔ جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کا ذکر کیا ہے۔

(۲) آل محمد یار ہردوری نے دیوان تواریخ (۱۴۴) میں ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے، جس کا عنوان ہے: "تاریخ کر شدن مرزا اسداللہ خاں، المتخلص بہ غالب والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی"۔

خود قطعہ یہ ہے۔

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے!
دوستو تاریخ اس کی غیب سے یوں سنی میں نے کہ "غالب کر ہوئے"!

اس مادہ تاریخ سے اعداد ۱۲۷۴ نکلتے ہیں جو سال ہجری ہے اور ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء تا ۱۱ اگست سنہ ۱۸۵۸ء سے تطابق رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آیندہ عرض کروں گا۔ یہ تاریخ ایک غلط فہمی کی بنا پر نکالی گئی ہے۔ دراصل میرزا صاحب اس سے برسوں پہلے بہرے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو تفتہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں: "بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں"۔ (اردوی: ۱۳۱) یکشنبہ ۱۹ دسمبر سنہ بالا کو منشی نبی بخش کے خط میں، جن کی بینائی میں ضعف آ گیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ: "کاروان مارا ہمیں شنیدن و دیدن و گفتن و رفتن متاع است، چرا بتاراج نرود۔ یکی را گوش گران است، ناہمنفسیں چہ سراید؟ یکی را چشم نگران نست تا کہ می آید"۔ (باغ دودر: ۷۱ الف) یہ بہرے ہونے کی تاریخ سے متعلق ان کے قطعی اور تصریحی بیانات ہیں۔ لیکن ہم اس تاریخ کو اور پیچھے لے جا سکتے ہیں۔ ایک فارسی خط میں نسفق کو تحریر کیا ہے: "اکنوں کہ دنداں نہ در ریختہ، و گوش گراں گشتہ، موی سپید است دردی بر آتش تنگ، دستا بلرزہ اندر ست، و پای در رکاب"۔ (پنج آہنگ:

۲۴۸، طبع دوم) اس خط میں جوان بخت کے سہرے کا قضیہ درپیش ہے۔ میرزا صاحب کا سہرا، ذوق کا جواب اور میرزا صاحب کی معذرت، یہ سب دہلی اردو اخبار، مورخہ ۶ جمادی الاولی ۱۲۶۸ھ (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ غالباً اس اخبار کو پڑھ کر شفق نے استفسار حال کیا، اور یہ سب کچھ اس واقعے کے بعد پیش آیا۔ اس لیے کہ میرزا صاحب نے بیان واقعہ سے پہلے لکھا ہے: "از نادیدہ دوران از دور بنگرند کہ نامہ را مژہ خوں فشانست و دل دردمند"۔ ظاہر ہے کہ دل کی دردمندی اور مژہ کی خوں فشانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی، اور کچھ ہو بھی، تو اتنی تو یقیناً نہ ہوگی کہ اسے ایسے پردرد انداز سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا میرزا صاحب کو سنہ ۱۸۵۲ء کے آخر کی بجائے اب آغاز میں بہرا ہونا چاہیے۔

مہر دوسرے خط میں فرماتے ہیں: "میں پانچ سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں"۔ (عود: ۱۱۱)

یہ خط اُن کے نام کے خطوں میں دوسرا ہے، اور غیر اغلب پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۰ء کو لکھا گیا تھا۔ اسی بنا پر اسے بھی ۱۸۵۰ء ہی کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے، تو پھر میرزا صاحب کے اس تخمینے کے پیش نظر انھیں ۱۸۵۰ء میں بھی ثقل سماعت کا مریض ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب ایک فارسی قصیدے میں، جو امجد علی شاہ کی مدح میں اور کلیات (ص ۳۴۲) میں چھپ چکا ہے۔ فرماتے ہیں:-

نغاں ز بیری و رنجوری و گرانی گوش ... کہ کرد ایں ہمہ دشوار کار آسان را

یہ قصیدہ میری رائے میں سنہ ۱۸۴۹ء کے آخر میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

کہ گفتہ است در آئین بزم سور و سرور ... کہ فرخی نبود روزہای آبان را

من از درازیٔ شبہای توس بیزارم ... کہ بہر انجمن آرد تکلف زمستان ہا

خوشا درازیٔ شب زانکہ گر بود تاریک ... درنگ در نظر افزوں بود چراغان را

وگر بود شب مہ، نیز بزم عیش آرای ... بجرعہ دیر نگہدار ماہ تابان را

قطب الدولہ کے نام کے ایک خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۴۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے یہ قصیدہ میر احمد حسین میکش کے ہاتھ قطب الدولہ کے پاس بھیجا تھا (پنج آہنگ، ۱۹۵ الف)۔ منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام کے ایک خط مورخہ ۲۰ فروری ۱۸۴۹ء میں میرزا صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "میر احمد حسین کہ بہنوائی شما است و میکش تخلص می کند بہ لکھنؤ رفتہ است۔ در ہر نامہ کہ بمن می فرستند، بشما سلام می نویسند" (ایضاً: ۸۹ ب)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میکش فروری سے خاصا قبل لکھنؤ جا چکے تھے۔ چونکہ مذکورۂ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت ماہِ آبان کی راتیں تھیں، اور آفتاب برج قوس میں تھا۔ اور آبان ایرانی سال کا آٹھواں مہینہ اور نومبر کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے قصیدے کو نومبر ۱۸۴۸ء میں لکھا جانا اور میرزا صاحب کو اس وقت بہرا ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب نے ایک فارسی قصیدہ آزردہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

نالم از درد دل، اما چارہ چوں خواہم ز کس   من کہ نتواند بگوش من رسد آوای من

اس شعر میں اپنے ضعف کا بمبالغہ بیان مقصود ہے۔ یعنی میرا حال کمزوری سے یہ ہو گیا ہے کہ مجھ سے آواز نہیں نکلتی یا نکلتی ہے تو بجد بہت۔ حتیٰ کہ میں خود اسے نہیں سن سکتا، پھر ایسی حالت میں کسی سے کیا اعانت کی امید رکھوں۔ وہ میری کب سن سکے گا۔ جو مدد کو آگے بڑھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ میرزا صاحب نے یہ مضمون اپنے بہرے پن کی حالت سے پیدا کیا ہو، تو کچھ تعجب نہیں۔ اگر یہ خدشہ درست ہے، تو انھیں ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے قبل بہرا ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ قصیدہ سنہ مذکور کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہونے کے باعث اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ میرزا صاحب سنہ ۱۸۵۲ء میں یقیناً بہرے تھے سنہ ۱۸۴۹ء میں گمان غالب ہے کہ بہرے ہوں اور سنہ ۱۸۴۵ء میں ان کے بہرے ہونے کا احتمال ہے۔

آل محمد مارہروی کو یوں غلط فہمی ہوئی کہ میرزا صاحب نے سرور کے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے لکھا تھا: "اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں۔ پر بینائی میں فتور نہیں" (عود: ۱۳) اس سے میرزا صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ گو بہرا ہوں۔ مگر اس بڑھاپے میں نگاہ تیز ہے۔ آل محمد صاحب یہ سمجھے کہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرا پن شروع ہوا۔

(۳) میرزا صاحب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۶ء کو یہ شکایت نواب خلد آشیاں کو لکھی ہے۔ ۱۲ مئی سنہ مذکورہ کو ذکا کے خط میں لکھتے ہیں کہ "رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کی بینائی میں فرق، رامپور سے دلی واپس چلتے ہوئے جو تکلیف میرزا صاحب نے اٹھائی تھی، اس کے باعث پیدا ہوا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ میرزا صاحب ہی نے ۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ (۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء) کو تفتہ کو لکھا ہے، "سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا" (خطوط: ۱/ ۹۶) چونکہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے لکھے ہوئے خط بنام سرور میں صاحب عالم کو مخاطب کر کے میرزا صاحب لکھ چکے ہیں کہ "اگرچہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں پر بینائی میں فتور نہیں۔ عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں"۔ اس لیے انھیں اس تاریخ کے بعد اور تفتہ کے نام کے خط کی تاریخ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء کے درمیان کسی وقت اس شکایت میں مبتلا ہونا چاہیے۔ اور اس صورت میں ۱۳ مارچ ۱۸۶۷ء کو ان کا یہ لکھنا کہ "امراض قدیم بڑھ گئے۔ دوران سر رعشہ اور ضعف بصر تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں" اضافی بیان ظاہر کرتا ہے۔

(۴) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۶ء

صفحہ ۵۱

(۱) میرزا صاحب نے ۱۲ مئی سنہ ۶۶ء کے ذکا کے نام کے ایک خط میں اس سے ملتے جلتے الفاظ میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: "آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔" (اردوئی: ۱۰۸)

(۲) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے اور سب جگہ پہلے ایڈیشن میں چھپی ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے ازراہ سہو بحر رمل مثمن مخبون کو، ہزج مثمن سالم لکھ دیا ہے۔ شمس الدین فقیر دہلوی نے رسالہ وافیہ (ورق ۱۹ الف) میں لکھا ہے: "بحر رمل مثمن مخبون، مثالش سعدی گوید۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی

والضاً سعدی گفتہ۔

مردمان منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی

تقطیعش بہ ہشت فعلاتن تمام می شود از آں جملہ رکن صدر فاعلاتن آمدہ باقی ہمہ مخبون در صدر و ابتدائے ایں وزن اگر سالم بجائے مخبون آرند یا بالعکس جائز است۔ پوشیدہ نماند کہ ایں وزن مشتبہ می گردد بہ بحر ہزج مکفوف مقطوع زیرا کہ قطع چوں در فاعلاتن در آید، مفاعیل بسکون لام می شود۔ و آن را بہ فعلاتن منقول می سازند۔ اما چوں فعلاتن [illegible] مخبون بے نقل حاصل می شود، اعتبار نمودنش از بحر رمل اقرب در صواب [illegible]"

صفحہ ۵۲

(۱) [illegible] پیسے کے لفافے پر ۱۵ مئی سنہ ۱۸۶۶ء تحریر ہے۔ غالباً دوسرے دن ڈاک میں بھیجا گیا تھا۔

(۲) با[illegible] سے بادشاہ ظفر مراد ہیں۔ میرزا صاحب کی ملازمت کی تفصیل کے لئے تعلقات قلعہ معلیٰ دیکھیے۔

صفحہ ۵۳

(۱) [illegible] کو سہواً مکرر لکھ دیا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "زُبیری" لکھا ہے۔

(۳) غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے۔ اس کے جواب میں [illegible] ۲۲ مئی سنہ ۱۸۶۶ء کو خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "مفاوضۂ عدیم المثال مع غزل [illegible] بعد آپ کے وصول شادمانی کا لایا۔ . . . سبحان اللہ مضمون [illegible] یہ غزل مذکور کا نیا اور عدیم المثال ہے۔

صفحہ ۵۵

(۱) منشی سیل چند کے لئے ان کے نام کے خطوط سے قبل کا نوٹ ملاحظہ فرمایئے۔

صفحہ ۵

(۱) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۶ء

(۲) نواب خلد آشیاں نے ۱۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کو جواباً تحریر فرمایا "اس صورت میں رسید ناگزیر نہیں ہے۔ اور حسب الایما واسطے بھیجے جانے ہنڈوی مشاہرہ آپ کے اس طور پر کہ تاریخ پہلی یا دوسری تک آپ کے پاس بھیج جایا کرے۔ حکم بنام اہالی سررشتہ کے صادر ہو گیا ہے"

صفحہ ۵

(۱) بدرالدین محمد چاچی، چاچ (تاشقند) کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ھ - ۷۵۲ھ) کے عہد میں ہندوستان آئے، اور اس کی مدح سرائی میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ سلطان محمد بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے ان کی کافی قدر و منزلت کی اور "فخر الزماں" خطاب دیا۔ بدر نے سنہ ۷۴۵ھ (۱۳۴۶ء) میں انتقال کیا۔ ان کے قصائد شہرت عام کے مالک ہیں۔ اور برسوں درسیات فارسی میں شامل رہے ہیں لیکن تلمیحات و کنایات کی اذ کے سبب سے بدر کے کلام میں لطف کم ہے۔

(۲) میرزا طاہر خاں وحید تخلص مشہور شاعر اور نثار، ور قزوین کا باشندہ ہے۔ سنہ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں شاہ عباس صفوی نے اپنا مجلس نویس مقرر کیا۔ سنہ ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں وزیر بنایا گیا اور ۱۸ سال تک اس عہدے پر رہا۔ عماد الدولہ خطاب غالباً اسی عہد کی یادگار ہے۔ تاریخ ایران مشہور بہ تاریخ طاہر وحید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہر کو نثر نویسی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ لیکن اشعار کی شہرت صرف عہدہ وزارت کی بدولت ہوئی۔ اس نے مجمع الشعرا کے نام سے ایک تذکرہ شعرا بھی لکھا تھا جس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کرزن کلکشن میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے کہ تقریباً سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) انتقال کیا۔

(۳) میرزا جلالائی طباطبائی اصفہان کا باشندہ ہے۔ سنہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں ہندوستان آیا، اور شاہ جہاں کے دربار کا مورخ مقرر ہوا۔ ابھی ۵ سال کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ حساد نے سازش کی اور کام ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ جلالا انشا میں خاص طرز کا مالک ہے یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ میرزا صاحب نے طبا طبائی کو سہواً "طبائی" لکھ دیا ہے

(۴) اعجاز خسروی ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی شاعر و نثر رحضرت امیر خسرو دہلوی متوفی سنہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کی تصنیف ہے۔ یہ نثر مرصع کی ممتاز کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے

(۵) ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے بیٹے اور دہلی کے آخری بادشاہ ظفر کے باپ تھے، رمضان سنہ ۱۱۷۳ھ (۲۳ اپریل ۱۷۶۰ء) کی تاریخ کو پیدا ہوئے اور ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر سنہ ۱۸۰۶ء) ہی کو ۴۸ سال کی عمر میں تخت

بیٹھے، اور ۳۱ سال ۹ ماہ ۱۲ دن سلطنت کر کے ۲۸ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۳ھ (۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو جمعے کے دن فوت ہو گئے (مفتاح التواریخ: ۳۷۵) اکبر شاہ اپنے والد کی طرح شاعر بھی تھے اور "شعاع" تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم کا مجموعہ کلام فارسی اردو ہندی موسوم بہ نادرات شاہی، کتاب خانہ رامپور کی طرف سے طبع ہو چکا ہے۔

(۲) میرزا صاحب کا یہ عریضہ نواب خلد آشیاں کے فرمان مورخہ ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کا جواب ہے۔ القاب و آداب کے بعد نواب صاحب نے تحریر فرمایا ہے "... درین ولا تقریظ شرح قصائد بدر چاچی از نوک قلم جلوہ خیز گردیدہ۔ اولاً بر ... صور عبدالرحمٰن وحید و مابقی بر طرز جلالائے طباطبائی نگاشتہ ام۔ چوں زیور اصلاح در گنج خانہ عالی طبیعت آں استاد زماں مخزون نیست، بہمیں نظر آں نقش باطل را مرسل ساختہ، مرقوم کہ آنچہ فطرت کمالت بیرشار نہ پسندد، خامۂ اعجاز نگار را بر وجہ تانیہ علاوہ ازیں مجموعۂ پریشانی بہ تلافیش تکلیف تحریر دہند و باسرع ازمنہ دیدہ سفیدان ایں دیار را از سرمہ جواہر آگیں جواب باصواب مسرور و شادماں سازند۔"

شرح قصائد بدر چاچی جس کا فرمان میں ذکر ہے، مولوی ... خاں بہادر مدار المہام کی تصنیف ہے۔ خان موصوف نواب خلد آشیاں کی خدمت میں زمانہ ولیعہدی سے آمد و رفت رکھتے تھے۔ زبان فارسی اور حساب وغیرہ سے بخوبی واقف اور قدرے عربی آشنا تھے۔ جب نواب صاحب تخت نشین ہوئے تو ان کا تقرب اور رسوخ یہاں تک بڑھا کہ ریاست کے مدار المہام بنائے گئے۔ مزاج میں قدرے درشتی اور جبر تھا۔ اس وجہ سے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو جامع مسجد کے اندر جلسہ میلاد النبی کا انتظام کرتے ہوئے نادر شاہ خاں نامی ایک پٹھان کے ہاتھ سے چاقو کا زخم کھا کر انتقال کر گئے۔ میاں منصور علی صاحب منصور رامپوری نے "زخصت" مادۂ تاریخ نکالا اخبار الصنادید (۲، ۱۵۲-۱۵۶) میں گیارہ تاریخ کو زخمی ہونا اور بارہ کو وفات لکھی ہے۔ ان کے خاندان کی ایک مستورۂ محترمہ کا بیان بھی یہی ہے۔ مگر جعفر عرشی نے بزرگان شہر سے پرس و جو کی تو بالاتفاق سب نے یہی بتایا کہ ہمیشہ سے ۱۲ ربیع الاول ہی کو جلسہ میلاد النبی ہوا کرتا ہے، اور یہ واقعہ سب کے نزدیک جامع مسجد کے اندر جلسے میں پیش آیا تھا۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم کی تحریر انھیں محترمہ کے بیان پر مبنی ہے جو ان کی رشتہ دار تھیں۔

(۷) اس نثر سے مذکورہ بالا تقریظ شرح قصائد چاچی مراد ہے۔ مثل میں یہ نثر موجود نہیں ہے اس لیے میرزا صاحب کے مواقع اصلاح معلوم نہیں ہو سکے۔

صفحہ ۵۸

(۱) نواب صاحب نے ۱۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کے فرمان میں (جس کا کچھ حصہ ۱۳ اگست کے عریضے کے حاشیے میں نقل کیا جا چکا ہے) میرزا صاحب تحریر فرمایا تھا: "... مطلب دگر، چونکہ راقم کو ترتیب بیاض انتخاب منتخبہ اساتذۂ ہی

وار دو کی منظوری ہے اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوان فارسی اور اردو اپنے کا فرما کر مع انتخاب کلام ضیاء الدین خاں صاحب لطف کریں، تا شامل انتخاب کے جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے۔" میرزا صاحب نے حسب الحکم اردو دیوان کا انتخاب ۸ ستمبر کو اور فارسی کلیات کا انتخاب ۲ ستمبر کو ارسال کیا۔ یہ دونوں انتخابات جو حسب الحکم فرمان مورخہ ۱۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۶۶ء) اس تاریخ سے قبل موصول ہو چکے تھے، کتب خانۂ سرکاری میں محفوظ تھے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ضروری حواشی اور مقدمے کے ساتھ "انتخاب غالب" کے نام سے ان کو بجنسہٖ شائع کر دیا گیا ہے۔ نواب صاحب کے لیے قدیم ۵ اشعار کی کئی چھوٹی چھوٹی بیاضیں کتابخانے میں محفوظ ہیں، مگر ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ سب یا کوئی ایک مذکورۂ بالا بیاض ہے۔

(۲) نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و جاگیر دار لوہارو کے خلف اصغر تھے۔ ان کی چچازاد بہن غالب سے منسوب تھیں۔ اس نسبتی رشتے کے علاوہ اہم رابطہ یہ تھا کہ نواب صاحب فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ یہ فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے (اردوی: ... ۲) ان کی سلامتیِ ذوق و حسن طبیعت کے میرزا صاحب اس درجہ معترف تھے کہ انھیں اپنا نمونہ کہتے تھے۔ کلیات فارسی میں ان کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

نیکو شیوہ، شاگردِ من بمن ماناست ۔۔۔ صنم بصورت خود می تراشد آذرِ من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم ۔۔۔ بود بپایہ ارسطوی من سکندرِ من

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر ادب، تاریخ، حکمت، سیاست مدن اور جغرافیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے الیٹ صاحب کو تاریخ ہند کی ترتیب میں اہم مدد دی تھی۔ ان کے کتب خانے کے متعلق میرزا صاحب لکھتے ہیں: "میرا ایک نسبتی بھائی، نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ، وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا، چنانچہ مجموعۂ نثریں اور کلیات نظم فارسی اور کلیات نظم اردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتابخانہ کہ ڈر کر عرض کرتا ہوں، ۲۰ ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں۔" (ا، عود: ۲۹) نواب ضیاء الدین خاں بہادر نے سنہ ۱۳۰۲ھ ہجری (۱۸۸۳ء) میں وفات پائی۔ مجروح نے مصرع "اب نہ باقی رہی وہ رونق شہر دہلی" سے ہجری سال نکالا ہے (تاریخ لطیف: ۲/۱۳۱)

(۳) میرزا صاحب نے یہاں "اُنس" لکھا ہے، مگر اوپر غزلوں کا ذکر ہے، اس لیے "اُن" ہونا چاہیے۔

(۴) نیز ملاحظہ ہو عرضداشت مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۶ء

(۵) میرزا صاحب نے ۱۲ مئی ۶۶ء کو ذکا کے خط میں لکھا ہے کہ: "رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر۔" خلد آشیاں کے ۱۸ نومبر سنہ ۶۶ء کے خط میں اس بیماری کا ذکر کر کے پھر ۱۴ مارچ ۶۷ء کو لکھا کہ "دوران سر، رعشہ اور ضعف بصر، یہ تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔"

لیکن میرزا صاحب کی اس بیماری کا پتا مارچ ۱۸۵۲ء میں بھی چلتا ہے۔ شفق کے نام کے فارسی خط میں جواں بخت کے سہرے کا جھگڑا بیان کرکے لکھا ہے کہ "کنوں کہ دندان فرو ریخت، و گوش گران گشت، موی سپید است و روی پر آژنگ، دست بلرزه اندر ست دیا کی در رکاب ....." (پنج آہنگ: ۸۱۴، طبع دوم)۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں جب کہ ان کی عمر ۵۴، ۵۵ برس کی تھی چند دانت گر چکے تھے، کان بہرے ہو گئے تھے، اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ لہٰذا میرزا صاحب کا رعشے کو نئی بیماری کہنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ یہ رامپور کے سفر کی سوغات ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہاں سے واپسی میں جو دکھ اٹھایا تھا اس کے نتیجے کے طور پر اس مرض میں زیادتی ہو گئی ہو۔

(۶) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۳ اگست ۱۸۶۶ء

(۷) یہ فارسی کے محاورے، نشان دادن، یعنی پتا بتانا کا ترجمہ ہے۔

صفحہ ۵۹

(۱) یہ عریضہ نواب صاحب کی اس تحریر کا جواب تھا: "..... نامۂ محبت آمیں مع لفافۂ بدر جاچی و مضامین اصلاح آگیں سرمۂ کس چشم وصول گشتہ روشنی بخش عیون دیدہ سفیدان انتظار گردید۔ چنانچہ بنظر ہمہ الفاظ کہ شاہد مجالنا با معان نظر ملاحظہ نشدہ مرسل داشتہ ام حتم اگر اقوال این ہمہ اساتذہ قابل اعتبار باشند فبہا۔ والا بعد مشاہدہ از چگونگی آں مطلع سازند۔ المرقوم ۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء"

آشیان جغد: عرفی، بیت

آشیان زغن: زاغ بچیدم بر سر سر قدم ساختہ برخار مغیلان رفتم

عذرا: زن دوشیزہ، و عذاری بفتح الزاء و کسرہا و عذرا و اشتا جمع۔ از منتہی الارب۔ از فرہنگ جہانگیری: "ارژنگ چہار معنی دارد، اول بمعنی ارتنگ است کہ مرقوم شد دوم نام مصوری بودہ مانند مانی، و سوم نام دیوی، چہارم نام پہلوانی از توران۔ ارتنگ نگارنامہ مانی نقاش، وگاہ ارتنگ بہ مانی اطلاق کنند" آغاز دیباچہ: "کہ کارخ زمانہ صدر نشینان محفل سخندانی را بہ نقوش خیالات رنگارنگ رشک ارژنگ مانی ساخت بس مانی ارژنگ بمعنی مانی نگارخانہ بودہ است، در کلام اہل ولایت نیز ملاحظہ رسیدہ

(۲) کتاب خانے کے پرانے کاغذات میں ایک ورق دستیاب ہوا تھا جس میں میر کے فارسی اردو شعر۔ بہ لے قلم سے خط لکھنے کے باریک نیلگوں کاغذ پر درج ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی اوراق کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے، جن کے ارسال کرنے کا میرزا صاحب نے ذکر کیا ہے بعد ازاں ایک سہ ورقہ مولوی مہدی علی خاں مرحوم (تحویلدار کتب خانہ) کے کاغذات میں سے دستیاب ہوا جس میں یہی اشعار کسی منشی کے ساتھ مندرج ہیں۔ یہ اول الذکر کی نقل معلوم ہوتی ہے اور اسی طرح کے کاغذ پر زیادہ خوشخط قلم سے تحریر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نقل رامپور میں سرکار کے حضور میں پیش کرنے کے لیے تیار کی گئی ہو گی۔ ان شعر۔

کے علاوہ تیر کا ایک فارسی قصیدہ بھی کتابخانے میں محفوظ ہے۔ یہ لارڈ رپن کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ اور تیر کے بہترین کلام میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے اشعار مذکورہ کے بعد اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مرسلہ شعر حسب ذیل ہیں:

غزلیات فارسی

گوئی کہ فیض روح رسد ناگہاں رسد — خوش طالعی کہ جذبۂ شوقی بجاں رسد
لذت شناس بیم بلا، زورق امید — در چار موجۂ انگلند ابر گراں رسد
ہاں نالۂ رسا، سر موجی کہ از سپہر — در گوش خلق زمزمۂ الاماں رسد
حاجی بپای مزد بہ دار السلام شد — ساقی بدستیاری بخت بدار الاماں رسد
گریم چو ابر کہ بدان کوی جسم راز — چون خس، بپای مردی آب رواں رسد
بر رغم محتسب سر بازار در کشیم — گر ساغری ز پیر مغاں ارمغاں رسد
تیر برآسماں بنہم باز پای ناز — گر ایں سر نیاز بر آں آستاں رسد

ایضاً

از دیدہ و دل ارزش لعل و گہر افتاد — تا آبلہ در سینہ و خون در جگر افتاد
اشکی کہ نہ دریا دل توار چشم تر افتاد — در دیدۂ صاحب نظران از نظر افتاد
عطار دو دم دشنہ و حلاج و سر دار — در موقف تسلیم چہ خوبہا بدر افتاد
گردم سر پا لغز تو، ای ساقی بدست — می در قدمم از دگراں بیشتر افتاد
گر شد ہنرم عیب ز دازدی طالع — از بہر چہ عیبم نہ بجائی ہنر افتاد
تیر کشدم نازکی ساعد قاتل — بالجملہ گر امروز زمینا زدم دگر افتاد

ایضاً

گر نباشم بدر دوست گدائی کم گیر — در ہمیرم بر ہش، بی سر و پائی کم گیر
نقش امید اگر جلوۂ دلخواہ نداد — از سر لوح ازل حسرت گدائی کم گیر
زشت دانستہ اگر دست کشیدی ز جفا — از جفاہای ندانستہ جفائی کم گیر
زخم گر بہ شدنی ہست و نمک پیدا نیست — مرض بیشتر انگار و دوائی کم گیر
غیر در خلوت دلدار اگر راہ نیافت — از بلاہای شب [illegible] بلائی کم گیر
مادر دہر نزاید پس از سہ مولود — منت خاکی دگر [illegible] کم گیر
گر فرو ریزد اساس کہن چار ارکان — اشکی و آہی و سوزی [illegible] کم گیر
گر فرو بست لب از حرف حقیقت تیر — از چمن بلبل آشفتہ نوائی کم گیر

ایضاً

بینش در بتکدہ سر بجنبیدن دہیم — نشۂ اقبال را داد رسیدن دہیم
رہ پرسش خون از دو چشم ز روی تنگ ماگسست — با سر تن خون شویم، داد چکیدن دہیم
ناوک خون خوارہ اش بر نکشیم از جگر — بلکہ لب زخم را ذوق مکیدن دہیم

هست ز ذوق تپش ماس نزاکت فزون
حیف که از جادهٔ جسم [illegible] بزلونی دهد!
گو بسر ما بار قصه زهر رد نشس
از نمک نطق ماست هر سخنا موذو قایاب
بیشتر از طرف خویش بهره بخواهد ربود
وعده بفردوست گر، مرحلهٔ پیش نیست
زاهد معه، رنگ رنگ جنس، دل ساده را
گو ز سر خونچکان بی بسر ره برند
پوشش جسم عزیز چادر اشکی بس است
سینه که از داغ عشق لالهٔ انا الشرق زد
هر نفس آید بگوش بانگ درای [illegible]
سال نشید غزل "دادهٔ پیغمبری" است ۱۲۱۶ھ

ورنه خنجر حیسان تن به تپیدن دهیم
سینهٔ خود را چو جیب، عرض دریدن دهیم
تا بفلک ناله را سر بکشیدن دهیم
لامسه را از فسون حس چشیدن دهیم
روح قدس را بدل راه خزیدن دهیم
شوق سبکتاز را گام دویدن دهیم
از پی نقش وفا داغ گزیدن دهیم
زینت فتراک را سر به بریدن دهیم
پر نمط عنکبوت تار تنیدن دهیم
از افق [illegible] جیب خور بدمیدن دهیم
ناقهٔ خود را جرس حکم چریدن دهیم
نیر بیان را چو فرس لطف نشیدن دهیم (۱)

فی النعت

خار رهش خشم را زحمت چیدن دهیم
لب بتکلم کشاد، نغمه ز انفاس زاد
بر سر عرش این طرف کله بشکنیم
بندهٔ آن خواجه ایم کز پی جنس بهشت
روح بدلی نمناک! درد نو دل را خوراک
شاهد [illegible] تجلی "رب ارنی" کشیم
تو که به [illegible] با دخوش روضه را

در دل رضوان، ز رشک، نیش خلیدن دهیم
دل بشنیدن دهیم، جان بشمیدن دهیم
بهر قدمبوس شاه، سر بخمیدن دهیم
معصیت خویش را برگ خریدن دهیم
در تن زار از غمت جان بدمیدن دهیم
صبح "ارنی" گوی را نیر دیدن دهیم
سوی چمن زار هند موج وزیدن دهیم

ایضاً

بر روی چو خور نقاب تا کی
یارب؛ ز تب غمم امان ده!
باشیم بدهر تا کجا شاد؟
خرمان بامید نسیهٔ شهد
ز امید بد وسوال تا چند؟
نشناخته بلهوس ز جا نبا نه
داغم که دل از فسردگی سوخت
کی بوده دکونت این ایشان؟
معمورهٔ هم چو شهر دهلی
وان مسجد جامع مقدس
نیر بجهان نگر به حسرت

دلجوئی ماهتاب تا کی؟
باد آتش و خاک آب تا کی؟
بینم بخواب خواب تا کی؟
از نقد شراب ناب تا کی؟
در یاس از جواب تا کی؟
بے مصرفی عتاب تا کی؟
بر بابزان ایں کباب تا کی؟
از شاه فراسیاب تا کی؟
ای [illegible] خراب تا کی؟
بازی [illegible] دشتاب تا کی؟
یا [illegible] حباب تا کی؟

(۱) مہدی علی خاں کے نسخے میں شعر [illegible] ۱۲۱۶ء ساقط ہیں نیز [illegible] اور مقطع [illegible]

اشعارِ ریختہ

فلک گر نہ تھا بار اٹھانے کے قابل — تو کیا تھے ہمیں آزمانے کے قابل
زہے! سربلندی شہیدِ وفا کی! — گر اس در پہ ہو سر جھلانے کے قابل
جہاں میں ہوئی صبحِ محشر نمایاں — کہ ہے شمعِ ہستی بجھانے کے قابل
مجھے رشک وحشت میں ہے نقشِ پا پر — نہیں خاک سے جو اٹھانے کے قابل
لیے سر پہ پھرتے ہیں وہ بارِ عصیاں — زمیں میں نہیں جو سمانے کے قابل
وہ لب کے ہلانے میں کیوں عذر کرتے — مگر تھے نہ ہم ہی جلانے کے قابل
مرا سینہ اے غیر کیا دیکھتا ہے — ترا منہ ہے اس زخم کھانے کے قابل
نفس ہی کے ہمراہ شاید بر آوے — جو حسرت کوئی ہو بر آنے کے قابل
کوئی اُن کو لے آئے خلوت سے یاں تک — کہ ہے شمعِ محفل جلانے کے قابل
نہ بولو ذرا بھی کہ گویا نہیں ہے — زباں کام میں کچھ بھی لانے کے قابل
یہ آنکھیں جو پتھرا گئیں تھیں نہ دیکھیں — ترِ پائے فاقل بچھانے کے قابل
جو آزردہ کہتے ہیں سچ ہے وہ رخشاں — کہ دنیا نہیں دل لگانے کے قابل

ایضاً

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش — شمع و گل قبر پہ رخشاں کی نہ لایا کیجے(1)
خاک کا پتلا ملائک کا بحق مسجود ہے! — سجدۂ حق میں بشر کا جبہ خاک آلود ہے
واں پہنچنا کیا ہو مشکل، آئے ہوں جس جا سے سہل — جادۂ دشتِ عدم، اپنا قدم فرسود ہے
یہ سرِ نخوت کہیں اب تو جھکے بہرِ خدا — مورچہ پا سبزۂ خط، پشتۂ گردہ ہے(2)
زلفِ مشکیں کی سیاہی بس گئی ہے آنکھ میں — رشتۂ تارِ نگاہِ دیدہ مشک اندود ہے(3)
بہ حصارِ آبگینہ شیشۂ ساعت کی شکل — گاہ زیر و گہ زبر پر باد و خاک آلود ہے
دل و خود آبلہ سے سینے میں کیونکر سمائے! — دل کے پرخوں ہونے سے ضیقِ محل افزود ہے
نغمہ خوش آہنیں دل کو بھی کر دیتا ہے موم — لحنِ داؤدی میں اعجازِ کفِ داؤد ہے
آفتابِ حشر سے دل سوختہ کو کیا ہراس! — دودِ آہِ دل سے سر پہ سایۂ ممدود ہے
دل فزا لطفِ سخن جاں کاہ عشوے کی نگاہ — نقدِ جان و جنسِ دل رہنِ زبان و سود ہے
سنگِ اسود ہو گئی ہے آہنی بت کی ہے ساخت — مومن و کافر کی، تیغِ دلستاں مسجود ہے
نفیِ نفی اثبات کہلاتی ہے، رخشاں اس لئے — ہم نہیں کہتے کہ یہ کون و مکاں نابود ہے

ایضاً

(4) مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں! — ساقیا، لیجو سنبھال ہمیں
کل نہ آئے جو اپنے وعدے پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

---

(1) مذکورہ نسخے میں یہ شعر بھی نہیں ہے (2) شعر ۲، ۶، ۸، ۹ مذکورہ نسخے میں نہیں۔

(3) نسخۂ مذکورہ میں مشک آلود ہے (4) یہاں سے آخر اشعار اردو تک مہدی علی خاں کے نسخے سے ماخوذ ہے۔

تیرے غصے نے ایک دم میں کیا
مردہ صد ہزار سال ہمیں

نقص سے رنج کچھ نہیں رخشاں
حق سے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

ایضاً

شاید بہار آئی کہ جو بخیۂ جنوں
پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار

سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ افسوس ہیں ملے؟
عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار

رخشاں یہ غم ہے قیس کے ملنے سے کیوں ہٹے؟
ملتے ہی ہیں ہم، سب عیار، یار یار

ایضاً

چاک بخیہ گر مرا گریباں ہے
دل کا مخبر مرا گریباں ہے

لاغری میں بریدہ ناخن سے
مختصر تر مرا گریباں ہے

رات بیٹھے سے سینہ کس کا ملا
کہ معطر مرا گریباں ہے

چاک کرنا جگر کا سکھلایا
میرا رہبر مرا گریباں ہے

سر آوارگان وحشت پر
سایہ گستر مرا گریباں ہے

پھر بہار آئی، اب جنوں کا ہاتھ
اور نشتر مرا گریباں ہے

ایضاً

کیا پہنچے تو فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو
[illegible] خدا کا بگھر نہ ہو

رخشاں جو آنے آتے اٹکی رک گئے پتلیاں
آنکھوں میں آگیا کوئی لخت جگر نہ ہو

ہو

سحر کہ باد سحر در دمید جان در تن
بنور صبح، نمود دم [illegible] دیدگان روشن

بہ تیغ صبح دل افسردہ روزگار بہار
چہ بارہ؟ باد وزان بخشش [illegible] چمن

سحر آبندہ برخ غازہ از نمود شفق
[illegible] نسیم سمن

فروغ صبح پدید آمدہ سرمۂ نور
کہ خواندہ گشت خط سرنوشتہ لعلی

[illegible]

[illegible]

بدان مشابه که روز جلوس قبلا خان(۱) — شده مزین و با زیب بلدهٔ پیکن(۲)

بدان نمونه که بر تون(۳) شده است آیین بند — دم ورود مظفر شهنشه جرمن

بگونه گونه نمائش گرفته آرایش — چه باره و در شهر و چه کوچه و برزن

خلائق از پی دید شکوه استقبال — شتافته خیز و دوان سوی ریل اسٹیشن

چه موج باد، همه ره سپر، چه خاص و عام! — چو سیل آب، همه قطره زن، چه مرد و چه زن!

بقطع راه، یکی بر دگر تقدم جوی — شمرده خار و خس راه اطلس و ادکن

بمانده هم بسر خلق، تا بپا نخلد — در ازدحام گر انداختی کسی سوزن

بود ز فرط خوشی پای کز کشاکش خلق — که پاره پاره بر اندام گشته پیراهن

چو روز عید کسان از ممر و آمد و رفت — بهیکدگر شده گرم معانقه همه تن

مصافحه شده یکدست سهوا از احباب — ز بسکه بوده بتخمین شهر دستک زن(۴)

غریو تشلک اتواب مژدهٔ بزم قدوم — فگنده غلغله در گنبد سپهر کهن

پیادگان و سواران ستاده به دو طرف — همه نهنگ فسونکار و همه پلنگ اوژن

گروه ساز نوازان بیکطرف از دو صف — بلب نی و بکف اندر جلاجل و ارغن

بدر دادر دوران همه اکابر شهر — فراهم آمده زانسان که گرد هم خرمن

محرزان یورپ جمع با اهالی هند — چنانکه سبزه و گل بر دمد بیک گلشن

ز سر گرفته کلاه انگلش سران ز ایسر — نهاده دست بسر هندی افسران ز امن

نموده پشت وخم و سر فرود پی تسلیم — که پای بوسی و سر بازی است از آن روشن

گزیده شیوهٔ دیرینه ادای تهنیت است — بوالیان ممالک ز اهل ملک و وطن

ولی بخاطر ما نظم لطیفه گذرد — امید آنکه قبولش کنند اهل فطن

که ویسرای عدالت گرای ملک آرای — خود از زبان در افشان بلهجهٔ ایمن

بشیریان بدهد مژدهٔ مبارکباد — ز عهد دولت خود عهد نشر عدل و منن

نوید راحت و آسودگی و آزادی — امید دفع بلاهای قحط و رنج و فتن

خدا نگاه، و قتیکه در میان سفر — بپا بدرسالی از امروز دور ناصبور(۵)

هم از تبدل آب و هوای ملک، و فصول — هم از مشقت راه دراز بسپردن

رسیده بود بهم رنج صعب ضعف قوی — بدان شرافت سراسر بدان لطیف بدن

عموم مردم هند وخصوص دهلویان — شدند مضطرب و مبتلای درد و حزن

دراز ساخته دست دعا بدرگه حق — برای صحت فرمانده زمین و زمن

دعای صبحگی و نیاز نیم شبی — هزار شکر که پذیرفت ایزد ذوالمن

بنزد و ترنم عا نیست ابرول آمد — هم از خسوف علالت هم از محاق محن

نگاهبان تو چیمان رو ستنان سپهر — که هست بر قدرت از قبیل چشم شاه جکن

بیادگار قدوم مسرت آثارت — ز شهر گشته فراموش شیوهٔ شیون

---

(۱) نبیرهٔ چنگیز خاں (۲) پائی تخت چین (۳) پائی تخت پروس (۴) چیرز دیہ انگریزی لفظ ہے اور اس کے معنی تالیاں ہیں عرفی (۵) در ترکی دو ... رسال گو یند ۔

بروزگار ورد جستگی بارست — بدشت لاف ہمای زدہ است بوم و زغن

زسر گرفتہ کلہ پیر و مہ پی تعظیم — اگر گذشتہ بہ ایوان تو زسپہر امن

سزد زشہپر کرد بیان بر کلہت — کہ گشتہ طرف کلاہت بچرخ سایہ فگن

زاختلاف صلاحت، امور سہل محال — زاتفاق رضایت، محال ہا آسان

گورنری بتو نازد و نہ تو بدان کہ فروغ — بود زشمع لگن را نہ شمع را از لگن

توان شمرد نظیرت چگونہ آغسطس؟ — کہ فتح یافتہ بریک ضعیفہ قبطی زن (۱)

توان نوشت عدیلت چگونہ اسکندر؟ — کہ فوج خود نتوانست برد تا بجمن

زاتحاد تو، بکول ہمہ پروٹسنٹ (۲) — زاعتقاد تو، خوشنود کیتھلک رومن (۳)

ازآنکہ ملت پیشینۂ مسیحی را — مصدقی بخلوص یقین و خوبی ظن

فزون تری زدگر عیسوی بہ حکم و بیان — برحم و شفقت قلبی و مہر و خلق حسن

زخلق دوستی و حق پرستی تو ہر ہر — نبود ہیچ کسی دشمنت جز اہرمن

بزیر حکم تو، از روی طول صد کشور — زرود بار برہم پتر (۴) تا بقطع دمن

مطیع امر تو، از راہ عرض یک عالم — زکوہسار ہمالہ (۶) الی بلاد دکن

اگر بعہد تو بودی، بیادی قاصر — زشرح دانش و داد تو خوش بیان ملٹن (۷)

ز مدح خوانی تو ہومر آمدی ابکم — زوصف گوئی تو ورجل آمدی الکن

مگر بگوشۂ دامان تو رسد دستش — دراز دست اگر آں آفریدہ شد بہمن

مراد از آں دل ترکی (۸) بود کہ اسب نہ — سنین عمر تو ہر گہ کند شمار از دن (۹)

خوشا مبارکی عہد معدلت مہدت! — کہ اعتدال ربیعی است وردی و بہمن

بسیجی اسپ سوارہ گر اکتساب ہوا — شود ہوائی بہاری بہیئت توسن

شکار شیر ازان رو بجد پسندیدہ — جناب ارل گری نوجوان شیر اوژن

کہ بخطر زدگان مشتغل شوند بدشت — ہزارگان بزراعت درودن و کشتن

ز فرط پیل کشتی و پلنگ افگنیش — شد، از روانی غول، دشت رودخانی بن (۱۰)

توئی کہ باز سپردی امارت کابل — بعبدرحمن حالا آں جلاشدہ زوطن

نہ صرف قطعۂ ملکی بدو ببخشیدی — کہ دادی اسلحہ و سیم و زر چہل مخزن

بداں قدر کہ ہم از سیم می تواں ساخت — برائے توپ گلو کہ گراں تر از آہن

بہ دور زر کہ بہ دور ہمال زر مردی — امیر فتح و ظفر یافتہ است بر دشمن

ولی باین ہمہ بذل توجہ و الطاف — اعانت و مدد بخشش و عطا و دہش

امید خیر سگالی از و نباید داشت — وفا کجاست بنزد بندہ مرد عہد شکن!

شعار اوست رضا جوئی و ہمسایہ — زدن دو چنگ پی اخذ زر بدو دامن

ومیکہ گشت معین یک انگلش افسر — پی سفیری آں ملک دیود مسکن

---

(۱) ملکہ قلوپطرا مصر، (۲) عقیدۂ دیگر حاکمان انگلش (۳) عقیدہ ولیسرائی (۴) دریائی شرقی ہندو را قصای بنگالہ (۵) موضع سرحد بلوچستان و افغانستان و قطع سے کو نمٹہ قرار دست ہرتی (۶) جبال شمالی ہند، ملٹن و ہومر و ورجل ہر سہ شاعران نامی یورپ بودہ اند (۸) دو ہزار سال (۹) یک سپید انگریزی (۱۰) نام یک دریای ایرلینڈ۔

بغور بندهٔ زنار بستی این تدبیر — نموده عرض بر اد زبیل ایجرتن[1]

کز آبیاری فرمان روای پنجاب — بود شگفته و شاداب نثر ز صد گلشن

بلی و طبعهٔ دیر بنه خیرخواه است — خصوص مدح طرازان سالخورده چو من

ادا نمودن اندرز در مطاوی مدح — نگار کردن مطلب بضمن شعر و سخن

درین چگامه که بالجمله تهنیت نامه است — وز آسمان شده بر نظم وی نثار پرن

یکی نگارش مدح است، بو که باد قبول — دگر گزارش رائی که بوده مستحسن

بیان بنده نه فخریه بلکه شکریه است — که از مهامن این عهد و میمن این مامن

نهاده اند بطبعم تقیضی از هر علم — سپرده اند بدل حصهٔ ز هر یک فن

ز نظم و نثر ز جغرافیه هم از تاریخ — ز حکمت عملی وز انتظام مدن

کلام پارسی پیری خیال آمیز — که فاش شد ز من این تازه طرز نو فاشن[2]

ز بنده بر تو رخشان کند قبول این نذر — که بر تراست ز سلک گهر بار زوشن

درم دعاست که هم بر دعا سخن سنجان — گرفته اند مبارک بفال ختم سخن

مدام تا شود آورده ذکر رستابیدم[3] — مدام تا که شود برده نام نل به دمن[4]

همیشه تا که ملاحی بود بدجله فرات — همیشه تا که معانق بود بگنگ جمن

بهم به مارکوئیس خوش زبادِ مارشنس[5] — چه در ممالک هند و چه در دیار رین[6]

بفرق هر دو گران مایه ومه دیگر ارل[7] — نفقدس سه اقالیم[8] ما دسایه فگن!

(۳) ضیاء الدین خاں بہادر کے کتب خانے کے غدر میں لٹ جانے کے متعلق میرزا صاحب نے صاحب عالم کو لکھا ہے: "میرا ایک سببی بھائی۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجموعۂ نثر اور کلیات نظم فارسی وار دو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ ڈر کر عرض کرتا ہوں بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا۔ لٹ گیا، ایک ورق باقی نہیں رہا۔" (اردوی: ۱۵۱، لاہور ایڈیشن) یوسف علی خاں عزیز کو تحریر کیا ہے: "بھائی تم کیا فرماتے ہو! جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں کے گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟" (ایضاً: ۱۵۲)

(۴) میرزا صاحب نے سہواً "غزلین" لکھ دیا ہے۔ صحیح "غ۔ ل۔ ی" ہے۔

صفحہ ۶۰

(۱) میرزا صاحب کے ۱۹ ستمبر کے عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے جو فرمان لکھا

---

(۱) نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب (۲) بمعنی طرز و روش لغت انگریزی (۳) رف سیلین و بدماد سارلیمر درانی جیوہ (۴) راجہ درانی اوجین (۵) بیگم مارکوئیس چنانکہ پرنسس یا ڈچس بیگمان پرنس و ڈیوک (۶) وطن دلیبرائی (۷) بمعنی ارل گرے مذکورہ فرزند کلان دلیبرائی (۸) جمع اقلیم، صول سہ گانہ تثلیثیاں کہ مراد از اب و ابن و روح است۔

تھا اُس کا اہم فقرہ میرزا صاحب نے نقل کیا ہے۔ نواب صاحب فرماتے ہیں :"...
... نیسانِ خامہ کہ در تحریر معانیٔ شعر عرفی و ہم تحقیقِ لفظِ ارتنگ وارژنگ گوہر بار گردیدہ،
بر خاطرِ اخلاص فرد ہر آئینہ مخفی و محتجب مباد کہ اکثر مالک رقاب اہلِ علم لغت ارتنگ
وارژنگ را بمعنیٔ واحد پنداشتہ اند۔ و عامۂ مفسرانِ کلامِ شیرازی مشابہ
"آشیاں چیدن" را مرادفِ آشیاں بستن نگاشتہ۔ چنانچہ نظیرش پہلی ملفوف عنبریں نامۂ
ہٰذا است بمطالعہ خواہد رسید۔ معہٰذا اگر طبعِ آں استادِ زماں بہ ترمیم الفاظ بالائی اجمل
نفوری داشتہ، ہمچناں حوالۂ قلم نماید کہ مجموعۂ عنبر را از لفز لیطِ اصلاح شدہ جو نفسانیت خود
محو سازم، زیرا کہ مرا ارزانِ مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است، نہ از عرفی و دیگراں۔ اما تقریری کہ بنظر گزشتہ
است صرف برائے اطلاع بہ منیفۂ ہٰذا مندرج گردید ..... المرقوم ۱۲ جمادی الاول سنہ ۸۳ ۱۲ھ مطابق
۱۲ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء"

۲ ملا عبد الصمد کی شاگردی کا اظہار سب سے پہلی بار قاطعِ برہان کی وساطت سے ہوا ہے۔ اس سے قبل میرزا صاحب
ہمیشہ یہی ظاہر کرتے رہے کہ فارسی دانی کا ملکہ قدرت کی طرف سے انھیں ودیعت ہوا ہے۔ کلکتے کے سفر میں
جو ادبی جھگڑا کلکتے والوں سے پیش آیا تھا، اس میں بھی میرزا صاحب نے عبد الصمد کے اقوال اور اس کی تعلیم کو ثبوت میں پیش
نہیں کیا۔ حالانکہ وہ موقع عبد الصمد کے ... لیے زیادہ مناسب تھا۔ اسی وجہ سے مجھے
اس میں شک ہے کہ عبد الصمد واقعی مسلم پارسی اکبرآباد آیا اور میرزا صاحب اس کے شاگرد
ہوئے، اور وہ دو برس میں انھیں فارسی گھول کر چلا گیا۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں
کو خموش کرنے کے لئے میرزا صاحب نے یہ نام دل سے گھڑ لیا تھا جیسا کہ خواجہ حالی مرحوم
نے خود میرزا صاحب ہی کی زبانی یادگارِ غالب (ص ۱۲) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۶۱

(۱) انجو کا نام جمال الدین حسین بن تاج حسن انجوی شیرازی اور لقب عضد الدولہ ہے۔ ان
کے آبا و اجداد فارس کے شہرۂ آفاق شہر شیراز کے باشندے تھے۔ یہ وہیں پیدا ہوئے بعد
ازاں تلاشِ روزگار ہندوستان آ گئے، اور بقول محمد صادق مینائی، سنہ ۱۰۳۵ھ
(۱۶۲۶ء) میں آگرے میں انتقال کیا۔ فرہنگِ جہانگیری اکبر کے عہد میں شروع ہو کر نور الدین جہانگیر
کی حکومت میں انجام کو پہنچی، اس لئے اس کے نام معنون کی گئی۔ انجو کو از راہِ تحقیر میاں لد
لکھا ہے۔ جیسے ایک جگہ فیضی کو لکھتے ہیں ۔"... اہلِ ہند میں سوا خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت
نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ (اردوی : ۲، خط ۳،)

(۲) رشید کا نام عبد الرشید الحسنی ہے۔ ان کے آباؤ اجداد مدینۂ منورہ کے رہنے والے تھے یہ
خود شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ منتخب اللغۃ اور فرہنگ رشیدی ان کی مصنفہ ہیں۔ شاعر
بھی تھے اور رشیدی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے تحفۂ رشیدی کے نام سے شعرائے فارسی کا
ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کرزن کلکشن میں
محفوظ ہے۔ میرزا امیر بیگ تمارکے تذکرہ حدائق الشعرا کا یہ ماخذ ہے۔ خزانۂ عامرہ (ص ۲۴۴، نولکشور
پریس) میں ان کا سالِ وفات "۱۰۷۶ ہجری (۱۶۶۶ء) لکھا ہے۔ غالب نے انھیں
حقارت کی راہ سے شیخ لکھا ہے، ورنہ وہ جانتے تھے کہ عبد الرشید حسنی

سید ہیں ایک اور جگہ بھی فرماتے ہیں در عبدالرشید میں کہا ہے اور میاں انجو میں کیا پیری ہے؟" (عود: ۱۴۸)

(۳) لالہ ٹیکچند بہار تخلص خان آرزو (متوفی سنہ ۱۱۶۹ ہجری/۱۷۵۵ء) کے شاگرد اور دہلی کے شاعر تھے۔ بہار عجم کے علاوہ ایک کتاب جواہر الحروف بھی ان کی تصنیف ہے سال وفات کسی تذکرے سے معلوم نہ ہو سکا۔

(۴) سیالکوٹی مل وارستہ تخلص، مصطلحات شعرا کے مصنف ہیں یہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی (متوفی سنہ ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء) کے شاگرد تھے۔ اور ۱۱۸۰ھ (۷۶-۱۷۶۶ء) میں فوت ہوئے ہیں۔ مصطلحات شعرا کو عام طور پر سنہ ۱۱۸۰ھ کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس کا نام "مصطلحات شعرا" تاریخی ہے۔ جس سے سنہ ۱۱۴۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ مصطلحات الشعرا مشہور ہو جانے کے باعث دال کے ۴ عدد زیادہ جوڑ لیے جاتے ہیں۔

(۵) میرزا صاحب نے سہواً اوس کے لکھ دیا ہے۔

(۶) یہاں لفظ "کے" ساقط ہو گیا ہے۔ آئندہ عریضے کو درست کرتے ہوئے میرزا صاحب نے یہ لفظ لکھا تھا۔ اس لیے میں نے بریکٹ میں بڑھا دیا۔

(۷) اصل خط میں سہواً ۱۰ تاریخ درج ہو گئی ہے۔ صحیح ۸ ستمبر ہے۔ اس لیے کہ اولاً خود میرزا صاحب ہی نے اس خط کے لفافے پر ۱۱ اکتوبر تاریخ لکھی ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ تاریخ کتابت کے دوسرے دن یہ خط پوسٹ کیا گیا تھا، ثانیاً نواب خلد آشیاں نے اس خط کا جواب جو آگے آرہا ہے، تیرہ اکتوبر کو دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خط کا جواب تیرہ کو لکھا جائے وہ خود تیرہ کا مکتوب نہیں ہو سکتا۔ میرزا صاحب کے عریضے کے بعض کنایات سے ناخوش ہو کر نواب صاحب نے جواباً تحریر فرمایا: "... مکتوب حیرت اسلوب مشعر اخراج معنی غلط نسبت ہندی نژادان پیشین و دیگر اعتراضہا وا ینکہ راقم را طرفہ بحث یاد نیست موصول مطالعہ گشتہ باعث استعجاب عظیم گردید۔ ازانجا کہ تاحال در ی تحقیق و تنقیح امور علمیہ کہ معاذ اللہ از مناظرہ و مناقشہ بچشم حق بیں کما بعید می نماید، امری دیگر بظہور نیامدہ و آنچہ حالی خاطرم بود بلا ریب درج حوالہ قلم و قانون سیح گردیدہ۔ لیکن می نازم بر ذہن موشگاف آں فرید زماں کہ نوشتہ ام را بر بحث و اجتہاد محمول نمودہ ۔۔۔ بجاست راقم را خط بحث کہ ہر دو خلاف دانش و موجب رنج دوستان است ۔۔۔ اگر آں مستفسر را ہمچنیں منظور باشد اشارتی ساز ند کر واسطہ ۔۔۔ نامہ ۔۔۔ خامہ را با مور خارج المبحث تکلیف ندادہ باشند کہ نتیجہ اس سوء صداقت الر ۔۔۔ امری بخیال نمی رسد و راقم پایۂ اعتبار محققان کہ صاحب تصانیف مقبول انام بودہ اند از خود زیادہ دانستہ بحوالہ کلام شاں پرداختہ۔ اگر نزد آں صمیم چیا دیدۂ آنہا قابل قبول نبود، باینکہ ہم برآں نمط تحریری برآمدند مصلحت این ذرا الملاست کہ از فہم ہیچمدانی بیرون است زیادہ ازیں نوشتن حکمت ۔۔۔ آموختن است۔ المرقوم ۳ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء" چونکہ نواب صاحب کے اس فرمان سے اظہار ناخوشی ہونا ناگزیر ہوتا تھا میرزا صاحب نے

فوراً معذرت نامہ مورخہ ۱۶ ماہ اکتوبر لکھ کر طلب عفو کی۔ نواب صاحب نے معذرت قبول کرتے ہوئے تحریر فرمایا " . . . . . مشفقا! سابق ازیں ملاحظہ مضمونِ مفاوضۂ سابقہ امری کہ منجیل شدہ بود بے سبب غبار کلفت خاطر گردیدہ حالا کہ آں مہربان تبادلیش پرداختند و از آں رفع شکوک الحال کردید۔ شاید لطف ما بر مقبول جمعیت باشد۔ المرقوم ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء" اس کے بعد نواب صاحب نے پھر کوئی غزل اصلاح کے لیے نہیں بھیجی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی طبیعت کا تکدر کلیتہً دور نہیں ہوا۔

صفحہ ۶۲

(۱) یہاں بیت کی جگہ مصرع کا مخفف "ع" ہونا چاہیے۔

(۲) صاحبزادہ سید مہدی علی خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے، صاحبزادہ حفیظ اللہ خاں بہادر کے بیٹے اور نواب خلد آشیاں کے بھانجے تھے۔ شعر و سخن کا شوق تھا، [illegible] تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں نواب فردوس مکان سے تلمذ تھا۔ آخر میں امیر احمد [illegible] کے شاگرد ہوئے۔ ۴۷ برس کی عمر پائی۔ ستائیسویں ماہ رمضان سنہ ۱۳۰۹ھ م ۲۱ اپریل ۱۸۹۲ء کو رحلت فرمائی۔ "انتخاب یادگار، ص ۳۸۴، و تاریخ رامپور، [illegible]"۔

(۳) تاریخ سلطنت انگلشیہ ہند طبع مرادآباد سنہ ۱۸۷۲ء ص ۳۰ میں لکھا ہے۔

"در ماہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء میں جناب نواب گورنر جنرل بہادر نے بمقام آگرہ دربار عام کیا، بسیار زینت بخشی۔ دربار میں والیان ریاست و رئیسانِ نامی و گرامی، علاوہ اُن رئیسان کے کہ جن کو تمغے "ستارۂ ہند" عطا ہوئے القدر ۸۲ کس کے تھے، علیٰ قدر مراتب اپنی اپنی جگہ کرسی نشین ہوئے۔ نواب گورنر جنرل بہادر، نائٹ گرانڈ ماسٹر اسٹار آف انڈیا بڑے تزک اور احتشام سے معہ دس بارہ صاحبان انگریز جلیل القدر کے پوشاک و خلاع شاہی پہنے ہوئے رونق افروز ہوئے۔

اول صاحب سکرٹری بہادر اسٹار آف انڈیا نے ارشاد ہو کر فرمان ملکۂ معظمہ بابت عطائی تمغہ ہائے اسٹار آف انڈیا کے پیش فرمایا۔ بعدہ بترتیب درجہ ہا، تمغۂ اسٹار آف انڈیا یعنی ستارۂ ہند عطا ہوئے"

اس کے بعد حاضرین دربار کی فہرست دی ہے۔ اس میں بسلسلہ والیان ریاست نمبر ۱ پر درج ہے "آنریبل نواب رامپور تشریف نہیں لائے"۔ اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے یہ سفر تمغۂ ستارۂ ہند پانے کے لیے کرنا چاہا تھا چنانچہ اکبرآباد تک سفر کا انتظام درست ہو چکا تھا۔ سرکار سنبھل تک تشریف بھی لے گئے تھے، مگر مزاج ناساز ہو جانے کی وجہ سے راستہ ہی سے مراجعت فرمائی۔

(۴) نواب خلد آشیاں کے اس سفر کے متعلق صاحب اخبار الصنادید (ج ۲، ص ۱۰۲) نے لکھا ہے: "مسٹر جان انگلش صاحب کمشنر و ایجنٹ ریاست نے نواب سید کلب علی خاں سے ہونہاری و بلند اقبالی کے آثار دیکھ کر بہت جلد آنریبل ایڈمنڈ ڈرمنڈ صاحب لفٹننٹ گورنر صوبجات متحدہ کے حضور میں رپورٹ کی، اور انھوں نے لارڈ لارنس صاحب

گورنر جنرل کی خدمت میں نواب سید کلب علی خاں بہادر کی لیاقت خداداد کی اطلاع کی۔ گورنر جنرل نے باظہار مسرت مثل نواب سید یوسف علی خاں کے نواب سید کلب علیخان کو بھی لیجسلیٹیو کونسل میں ممبر تجویز کیا۔ نواب صاحب نے ہنگام استمزاج باوجود ناچاقیٔ طبیعت و ضعف باقتضای عزم بلند ممبری قبول کی۔ ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۸ دسمبر ۱۸۶۶ء) کو رامپور سے علیگڑھ تک گاڑی کی ڈاک میں اور علیگڑھ سے کلکتے تک تخمیناً پانسو ہمراہیوں کے ساتھ ریل کے ذریعے سے گئے۔ اثنائے راہ میں کانپور، الہ آباد، اور بنارس وغیرہ ہر مقام پر حکام نے استقبال کیا اور سلامی سر ہوئی۔ مہاراجہ الیسری پرشاد نارائن سنگھ صاحب جی سی، ایس، آئی، والیٔ کاشی نریس نے بنارس میں بنظر اتحاد قدیمی دھوم سے دعوت کی۔ کلکتے میں گورنر جنرل کی طرف سے بطرز مرغوب استقبال ہوا، سلامی سر ہوئی۔ آب و ہوائے کلکتہ نے ان کے مزاج سے بھی مخالفت کی، اور طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف رہی۔ پھر بھی کونسل میں کئی اجلاس کیے۔ جب ناسازی زیادہ بڑھی، تو حسب اصرار گورنر جنرل ڈاکٹر بیلی سے علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر کی رای ہوئی کہ آب و ہوا یہاں کی ان کے مخالف ہے، بلکہ قیام کلکتے سے امراض شدید لاحق ہونے کا اندیشہ ہے، مگر نواب صاحب نے اسے قبول نہ کیا۔ جب گورنر جنرل کو اس کا علم آیا، تو مقتضای محبت خاص بکمال اصرار واپس کیا۔ ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۸۳ھ (۳۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء) کو کلکتے سے رامپور واپس ہوئے۔

میرزا صاحب کے ۶ ہیلیفے (۸۱) کے لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب محلہ کاشی پور کے مکان نمبر ۵ و ۷ میں قیام فرما ہوئے تھے۔ میرزا صاحب کا قطعۂ تاریخ حسب الحکم حضور اخبار دبدبۂ سکندری میں طبع ہوا اور ۳ نومبر کو اس کی اطلاع ان الفاظ میں میرزا صاحب کو دیگئی تھی: "تاریخ مذکورہ کہ بطرز نو و عدیم المثال ست در اخبار دبدبۂ سکندری طبع گردیدہ شد۔"

صفحہ ۶۳

(۱) خط میں کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے قوسین میں لفافے کی تاریخ اضافہ کردی ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "بابت" لکھا ہے۔

(۳) دہلی سے مراد آباد کو جو ریلوے لائن آئی ہے، اس پر دہلی جنکشن کے بعد شاہدرہ اور پھر غازی آباد کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہ بستی پہلے نواب غازی الدین خاں بہادر عماد الملک وزیر شاہ عالمگیر ثانی و شاہ عالم ثانی نے سنہ ھ (۱۷۴۰ء) میں بسائی تھی۔ پہلے اُن کے نام پر غازی الدین نگر کہلاتی تھی۔ جب ریل کے محکمے نے اسے جنکشن بنایا، تو بول چال کی سہولت کی خاطر غازی آباد نام رکھدیا۔ اسی نام سے اب مشہور ہے۔ غلے کی منڈی ہو جانے سے آبادی اور دولت دونوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور یہ قصبے سے ترقی کر کے شہر کے درجے پر پہنچ گیا ہے (امپیریل گزیٹر: ۵/۱۲۶۔)

(۴) اس خط کے جواب کا مسودہ مثلوں میں نہیں ہے۔

صفحہ ۴۶

(۱) مرزا صاحب نے اس خط میں تین جگہ اس لفظ کو اسی طرح لکھا ہے۔
(۲) آثار الصنادید، یادگارِ دہلی، سیر احمد دلی اللّٰہی اور واقعاتِ دارالحکومت دہلی بشیر احمد دہلوی
میں اس کوٹھی کا ذکر نہیں ملتا۔
(۳) یہاں لفظ (سے) زیادہ معلوم ہوتا ہے۔
(۴) بیگم سے مراد جہاں آرا بیگم ہیں، جو شاہ جہاں بادشاہ کی چہیتی بیٹی تھیں۔ یہ ممتاز محل کے بطن سے
۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) کو بدھ کے دن پیدا ہوئیں۔ ماں کو شہزادی سے اتنی محبت تھی
کہ اس نے مرتے وقت شاہ جہاں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد کا آدھا حصہ جہاں آرا کو دیکر باقی
آدھا بیٹوں میں تقسیم کرنا۔ خود شاہ جہاں ایسا چاہتا تھا کہ بیٹی کی صحت کی خاطر ہندوستان میں
انگریزوں کا بیج بو لیا، جو آکاس بیل کی طرح آخر میں مغل سلطنت کے درخت کی شاخوں پر چھا کر
خود درخت ہی کو کھا گیا۔ صورت یہ پیش آئی کہ سنہ ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں جہاں آرا کی
سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ سوءِ اتفاق کہ عین سالگرہ کے دن شمع کی لو سے شہزادی کا دامن جل اٹھا
شہزادی اس وقت دربار شاہی کے پاس کھڑی تھی۔ پاس جا سے زنانے کی طرف بھاگی ہوا
لگنے سے سب کپڑوں نے آگ لے لی، اور جہاں آرا کا گلاب سا بدن جل کر کوئلہ ہو گیا۔ باپ کو
اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ مگر فرطِ محبت میں دوا اور دعا کا کوئی جتن نہ چھوڑا۔
ہزار ہا روپیہ خیرات کیا گیا، اور ملک بھر کے حاذق اطبا اکٹھے کر لیے گئے۔ قسمت دیکھیے کہ ان
میں سے کوئی کامیاب نہ ہوا۔ اس زمانے میں ایک انگریز ڈاکٹر بندر سورت میں آیا ہوا تھا۔
بادشاہ نے اس کی شہرت سن کر طلب کیا۔ اس کے پانچ مہینے کے علاج سے شہزادی تندرست
ہو گئی۔ بادشاہ نے جشنِ صحت میں لاکھوں روپیہ ایثار کیا۔ قدسی کو قصیدۂ تہنیت پر، جس کی
رباعی کا یہ شعر لا جواب ہے۔

تا سرزدہ از شمع چنین بی ادبی
پروانہ زعشق شمع را سوختہ است

۵ ہزار روپے کا صلہ عطا ہوا۔ ڈاکٹر کو چاندی میں تلوا دیا، اور اس قوم پرور کی استدعا پر
ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں آزاد تجارت کا فرمان عطا ہوا۔
جہاں آرا کو قدرت نے ذہنِ رسا اور روشن دماغ عطا کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے
اس جوہر کو نکھار دیا، اور وہ عربی، فارسی اور نثر کی میں صاحب دستگاہ ہو گئی۔ اپنی اعلیٰ دماغی
خوبیوں کی بدولت باپ کے مزاج میں بیحد دخیل تھی۔ بھائیوں کی جنگ میں دارا شکوہ کی
حامی رہی، اور عالمگیر کے بادشاہ ہو جانے پر آگرے کے قلعے میں باپ کی خدمت کی خاطر
جا پڑی تھی۔
تصوف کی دلدادہ اور خاندانِ چشت کی شیدا اور مرید تھی۔ صاحب تصنیف و تالیف
بھی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی سیرت پر مونس الارواح نام کی کتاب اس کی تصنیف ہے
شعر بھی کہتی تھی، مگر کم۔ کتاب خانۂ رامپور میں رسالۂ خواجہ عبداللہ انصاری کا ایک خوشخط
نسخہ ایران کے مشہور خطاط میر علی الکاتب کے قلم کا محفوظ ہے، جس پر جہانگیر اور شاہ جہاں کی
دو تحریریں ثبت ہیں۔ اس کے آخر میں جہاں آرا نے اپنے قلم سے ایک عبارت لکھی ہے۔

مزاج میں انکسار، فیاضی، مہمان نوازی، بردباری اور ثقاہت بہت تھی۔ سادہ معاشرت کو پسند کرتی، اور تزک و احتشام سے متنفر تھی۔ اس نے ۳ رمضان ۱۰۹۲ھ (۵ ستمبر ۱۶۸۱ء) کو انتقال کیا، اور شاہ نظام الدین میں سنگِ مرمر کے خود تعمیر کردہ مجمر میں دفن ہوئی۔ (واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی: ۲، ۲۲۹، ح ۱)

جہاں آرا نے ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں چاندنی چوک کی جانب شمال مکانات دلکشا اور ایک باغ بنایا تھا، جو پہلے صاحب آباد کہلاتا تھا، بعد ازاں بیگم کا باغ مشہور ہوا، اور اب ملکہ کی مورت نصب ہو جانے کے بعد ملکہ کا باغ کہلاتا ہے۔ یہ ۹۷۰ گز لمبا اور ۲۴۰ گز کا چوڑا تھا۔ اس میں عجیب عجیب بارہ دریاں اور مکانات تھے۔ اس میں نہر جاری تھی۔ اور جگہ جگہ فوارے اور حوض بنائے گئے تھے۔ مرورِ ایام سے اس باغ کی وضع قطع بالکل بدل گئی۔ چار دیواری، جس میں جا بجا برج بنے ہوئے تھے، غدر میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اب صرف چار برج رہ گئے ہیں دو تو باغ کے احاطے کے شمال رُخ پر موجود ہیں، تیسرا انبل کے کرٹرے کے پاس اور چوتھا اس مقام پر ہے، جہاں عجائب خانے کے تیر وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ پرانے درخت کاٹ کر نئے چمن لگائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ پیچیں پڑی ہیں۔ بیچ میں ایک خوبصورت گول چبوترہ بنا کر اُس پاس گھاس کے تختے بو کر پھولوں کے گملے دھرے ہیں۔ پہلے اس چبوترے پر بینڈ بجتا تھا، پھر موقوف ہو گیا۔ یہیں ایک سنگِ مرمر کا حوض تھا، جو اب قلعے میں ہے۔ اس میں فوارہ لگا ہوا تھا، اور بیچ میں سے نہر رواں تھی۔ چند سال ہوئے باغ اور اسٹیشن کے بیچ کی سڑک چوڑی کی گئی۔ تو کچھ حصہ باغ کا اُس میں شامل ہو گیا۔ (آثار الصنادید: ۲، ۵۵، طبعِ دہلی ۱۲۶۳ھ = ۱۸۴۷ء، واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی: ۲، ۲۳۱)

(۵) سنہ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتے سے رانی گنج تک جو ۱۲۰ میل کا فاصلہ ہے، جاری تھی۔ تعمیر کا کام برابر دہلی تک جاری رہا۔ پہلے آگرے سے جمنا کے غربی کنارے کے ساتھ ساتھ داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اس کی جگہ ٹونڈلا جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے مشرقی کنارے جو لائن کا حصہ سنہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا۔ اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء کے آخر میں یہ پل، جو ۲۶۴۰ فٹ لمبا ہے، ۶۶۰۴۵۵ روپے کی لاگت سے بن کر تیار ہوا، اور یکم جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گزری۔ اور این، ڈبلیو آر نے، جو اُس زمانے میں سندھ پنجاب دہلی ریلوے کہلاتی تھی، غازی آباد کو ریل کے ذریعے دلی سے ملا دیا۔ اس ریل کا اسٹیشن پہلے ہملٹن روڈ پر بنا تھا، جسے میرزا صاحب نے دلی محمد سوداگر کی کوٹھی کے پاس بتایا ہے۔ اب اُس جگہ این ڈبلیو کا مال گودام ہے۔ موجودہ ریلوے اسٹیشن دراصل ای، آئی، آر، کا ہے۔ راجپوتانہ مالوہ ریلوے کا اسٹیشن موری دروازے تھا، این ڈبلیو آر کا ہملٹن روڈ پر، ای، آئی، آر سے جداگانہ۔ مسافروں کو تکلیف ہوتی تھی۔ ان سب کو ملا کر یہ ایک اسٹیشن بنا دیا گیا۔ (یادگارِ دہلی: ۱۳۵، واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی: ۱، ۳۴۷ و ۲، ۲۲۳)

نواب خلد آشیاں غالباً دلی سے اس بنا پر سوار نہ ہوئے کہ دسمبر کے آخر تک انھیں اس پل کے کھلنے کی صحیح تاریخ کا علم نہ تھا۔

(۶) میرزا صاحب نے اس جملے اور آئندہ جملے کے درمیان ۷ لفظ دبے ہیں۔
اس عریضے کے جواب میں ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا:
"... چون راقم عنقریب روانۂ کلکتہ می شود۔ چنانچہ برای انتظام گاڑیہای ریل رفعت دعوالی مرتبت محمد اصغر علی خاں رسالدار را روانۂ آنجا نمودہ شد و ہنوز تاریخ رسیدن بمقام اسٹیشن ریل دہلی مقرر نگشتہ، لہذا حوالۂ خامۂ مودت نگاری شود کہ حالِ تقرر تاریخ رسیدن آنجا از خانِ معزی الیہ دریافت نمودہ شود۔" رسالدار صاحب کے خاندان میں تلاش کرنے پر بھی میرزا صاحب کا کوئی خط نہ ملا، جس سے پتا چلتا کہ اُن سے میرزا صاحب نے استفسار کیا یا نہیں۔ لیکن یہ امر اخبار الصنادید کے محولۂ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ سرکار علی گڑھ تک گھوڑوں کی ڈاک میں اور وہاں سے بذریعہ ریل کلکتے گئے تھے، اس لیے یہ یقین ہے کہ میرزا صاحب سعادتِ ملاقات حاصل نہ کر سکے۔

(۷) میرزا صاحب کا یہ ارشاد سہو پر مبنی ہے، کیونکہ اُن کی پنشن، دربار اور خلعت یہ تینوں اعزاز غدر کے بعد بند ہو گئے تھے۔ تفصیل دیباچے کی بحث تعلقات انگریزی میں ملاحظہ ہو۔

(۸) سر ڈانل میکلوڈ صاحب مراد ہیں۔ یہ لفٹنٹ جنرل ڈنکن میکلوڈ کے یہاں فورٹ ولیم، کلکتہ، میں ۶ جون سنہ ۱۸۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ ولایت جا کر تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے، اور صوبۂ بنگال میں ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۹ء تک اضلاع ساگر و نربدا اور بنارس میں رہے۔ ۱۸۵۴ء میں پنجاب کے جوڈیشل کمشنر ہوئے۔ غدر سنہ ۵۷ء میں لاہور میں تھے۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے اور ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ء کو لندن کی زمین دوز ریل کے ایک حادثے سے انتقال کر گئے۔ یہ مشرقی علوم و فنون کے بڑے حامی تھے، اور چاہتے تھے کہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم کی تعلیم دی جائے۔ پنجاب یونیورسٹی انھیں نے قائم کی تھی۔

(۹) سبد چین (ص ۷۹) میں یہ رباعی میکلوڈ کی مدح کی چھپی ہے:

ای پایہ بلند ساز والا جاہی   از مہر تو باد ہر چہ از حق خواہی
مکلوڈ کہ در صورتِ نعمت   چوں مہر عیاں معنی مدح الٰہی

بعید نہیں، اسی کو خوشخط لکھا کر پیش کیا ہو۔ لیکن اسی کتاب میں ایک قطعہ بھی درج ہے جس کی ۱۲ بیتیں ہیں، اور پہلا شعر یہ ہے:

بزم نواب جم حشم مکلوڈ   بوستانی است پُر ز نعمت و ناز

اس میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

آمدم تا بہ پیش وی نالم   از جفای زمانۂ ناساز
از ادب دم نمی توانم زد   با چنین داغہای سینہ گداز
چون رسد وقت کار سر تا سر   گویم اما بہ شیوۂ ایجاز
مدح بانوی انگلستان است   بر زبان من از زمانِ دراز
اندرین پایہ با سنِ مسکین   نیست در ہند ہیچ کس انباز
غالبم اسم شہرۂ نام نسبت   اسد اللہ خانِ مدح طراز

(سبدچین: ۴۷)
میرزا صاحب کا ایک اور، ۷ اشعر کا قطعہ، کسی گورنر کی مدح میں ہے۔ اُس کا پہلا شعر حسب ذیل ہے:

سپس ازادای سپاس خدای عزوجل — ثنای حضرت نواب می کنم انشا

اس میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

زہی عطای گرانمایہ گرامی قدر — کہ سود تارک من از شرف باوج سما
توان فگند بہ گیتی بنای منت بہشت — زہفت پارچہ کان ہر یکی است بیش بہا
حمائل گہر و جیغہ و دگر سرپیچ — چو روستان فلک با فروغ وا ضیا
چو بی طلب بمن اینہا رسیدہ است بود — زبہر مطلب خویشم تو قع امضا
تو قع آنکہ یکی سارتی فکٹ یابم — رہینگاہ عنایات والی والا

(سبدچین ۵۵)
خیال یہ ہے کہ قطعہ ۶ اوّل دربار میں تعارف کے طور پر رُباعی کے ساتھ پیش کیا ہوگا) اور دوسرا قطعہ خلعت پانے کے بعد اظہار تشکر اور طلب سارٹیفکٹ کے لیے لکھا ہوگا۔ اس قطعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ باوجود منٹگمری صاحب سے خلعت پانے کے میرزا صاحب کو یہ یقین نہ تھا کہ اُن کا خلعت و دربار جاری ہے۔ اُنھیں دربار میں مدعو نہ کیے جانے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

صفحہ ۶۵

(۱) میرزا صاحب کے اس بیان سے کہ نہ تو کمشنر کو علم تھا کہ اسداللہ خاں کو خلعت ملے گا، اور نہ مجھے اس کا خیال گزرتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خلعت بحال نہیں ہوا تھا، صرف شرکت دربار کی اجازت ملی تھی، ورنہ گورنر خلعت دیتے وقت کیوں کہتا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ اس کے شکریے میں میرزا صاحب نے جو قطعہ لکھا ہے، اُس کا یہ شعر ابھی گزر چکا ہے:

چو بے طلب بمن اینہا رسیدہ است بود — زبہر مطلب خویشم تو قع امضا

اُس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ میرزا صاحب خلعت سے مایوس تھے، ورنہ بے طلب کی قید کیوں لگاتے۔ لیکن وہ خود بیان کرتے ہیں کہ سنہ ۱۸۶۳ء میں منٹگمری صاحب نے بلا کر خلعت دیا، تو کہا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔" اس صورت میں یہ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اُنھوں نے کسی مصلحت سے اُس وقت یہ بات مشہور کر دی تھی۔ (مکاتیب: ۴۸)

(۲) میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات میں تناویز لکھا ہے۔ یہ ایک قسم کا نہایت چمکدار موٹا ریشمی کپڑا ہوتا ہے پہلے بخارا سے آتا تھا، اب یورپ سے آتا ہے اور کرنٹ کی قسم میں شمار ہوتا ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "دو بوجہہ" لکھا ہے۔

(۴) یہ عریضہ میرزا صاحب نے کلکتے کے پتے سے لکھا تھا چنانچہ لفافے پر تحریر ہے: کلکتہ، محلہ کاشی پور، خانہ نمبر ۷ اور نمبر ۵۔

صفحہ ۶۶

(۱) لارڈ لارنس مراد ہیں۔ یہ الیگزنڈر لارنس کے چھٹے بیٹے تھے۔ ۴ مارچ ۱۸۱۱ء کو پیدا ہوئے فروری ۱۸۳۰ء میں کلکتے آکر سول سروس میں نام لکھایا۔ ۸ برس تک دہلی اور اس کے اطراف میں اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء تک دوبارہ اسی علاقے میں خدمات انجام دیں۔ ۱۸۴۶ء میں ستلج جالندھر کے دوآبے کے کمشنر مقرر ہوئے۔ لاہور میں رزیڈنٹ بھی رہے۔ کانگڑے کی بغاوت فرو کی۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کے الحاق کے بعد انتظامی بورڈ کے ممبر مقرر ہوئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں بورڈ توڑ کر انھیں پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا۔ اپنے بھائی سرہنری لارنس سے جمہوری معاملات میں انھیں معقول اور سنجیدہ اختلاف تھا۔ غدر میں پنجاب کو محفوظ رکھا اور فوجی مدد بھیج کر دہلی کے محاصرے میں اہم اعانت کی۔ یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل اور وئسرائے مقرر ہوئے، اور ۱۲ جنوری ۱۸۶۹ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہ بہت طاقتور مستعد، جفاکش اور کٹر مذہبی آدمی تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی پر "بیرون لارنس آف دی پنجاب اینڈ گریٹلی" کے اعزاز سے مفتخر ہوئے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۷۹ء کو لندن میں انتقال کیا اور ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن ہوئے۔

(۲) اس سلسلے میں نواب خلد آشیاں نے ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو تحریر فرمایا: "مشفقا! الجنابیت ایزدی مخلص بخیریت تمام بتاریخ ۷ جنوری سنہ حال فائز مقام کلکتہ گردید۔ و ملاقاتِ جنابِ مستطاب، معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر، دام شوکتہم، و دیگر صاحبانِ عالی شان ونیز اجلاس کونسل بعنوانِ شائستہ و طرزِ بایستہ بپایۂ حصول رسید۔"

(۳) دونوں لڑکوں سے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مراد ہیں۔ دیباچے میں ان کا حال تفصیل سے لکھ دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ میرزا صاحب کی استدعا منظور نہیں ہوئی، اور ان کی زندگی میں کسی لڑکے کی تنخواہ مقرر نہ کی گئی۔

(۴) نواب خلد آشیاں نے ۲۷ رمضان ۱۲۸۳ھ (۳ فروری ۱۸۶۷ء) کو لکھا تھا: "بتاریخ سی ویکم ماہ جنوری سنہ حال راقم بعنایتِ الٰہی مع الخیر بعد شمول جیز اجلاس کونسل از مقام کلکتہ داخل رامپور گردید۔" تعجب ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۱۴ فروری تک موصول نہیں ہوا۔

(۵) اصل خط میں سہواً "دو حادیں" تحریر ہو گیا ہے۔

صفحہ ۶۷

(۱) لفافے پر ۱۵ فروری درج ہے۔ غالباً دوسرے دن ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔

(۲) صحیح لفظ "طمانینت" ہے، مگر اردو زبان کے عام و خاص سب اطمانیت ہی بولتے ہیں۔

صفحہ ۶۸

(۱) بریکٹ کی عبارت میرزا صاحب سے سہواً چھوٹ گئی تھی۔ میں نے دیگر عرائض سے ایزاد

کر دی ہے تاکہ کلام تمام ہو جائے۔
(۲) اصل میں "ہانت" ہے۔

صفحہ ۶۹

(۱) لفافے کی پشت پر تحریر ہے: "پیش نمودہ شد۔ قطعۂ نوشتہ نزدِ مہتمم اخبار برای طبع ... فرستادہ شود .... مطابق ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء"
(۲) انتخاب یادگار (ص ۹۰) اور اخبار الصنادید (ج ۲، ص ۱۳۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۲ھ (مارچ سنہ ۱۸۶۶ء) میں جو جلوس کا پہلا سال تھا، باغ بینظیر کے میلے کا آغاز کیا۔ یہ میلہ آٹھ روز بڑی رونق سے رہتا تھا۔ باغ میں ہر قسم کے مال کی دکانیں ہوتی تھیں، جن میں سے یہاں ذکر کے قابل مطبع نظامی کانپور کے مالک عبد الرحمن خاں بن حاجی محمد روشن خاں کی کتابوں کی دکان ہے۔ روہیلکھنڈ کے اکثر معزز رؤسا بھی اس میلے میں شریک اور نواب خلد آشیاں کے مہمان ہوتے تھے۔ نواب صاحب خود بھی آٹھ روز برابر وہیں مقیم رہتے تھے، اور اکثر اوقات دکانوں پر تشریف لے جا کر اسباب خریدتے۔ قسم قسم کے جلسے، مشاعرے اور تماشے بھی ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں میلے کی ترقی کے لیے ایک عمارت تیار کرا کے اس میں قدم شریف رکھوایا، پھر میلے میں دلی والوں کی طرح اس پر پنکھا چڑھایا جاتا تھا۔ بائیس میلے نواب صاحب نے کیے۔ تئیسواں میلہ قریب تھا کہ رحلت کی۔
(۳) فائلوں میں اس خط کا جواب شامل نہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ سرکار نے کن لفظوں میں اس قطعے کی داد دی۔

صفحہ ۷۰

(۱) سبد چین (ص ۵۱) میں اس قطعے کے یہ ۶ شعر درج ہیں:

نمائشگہی در خور شان خویش	بر آراست نواب عالی جناب
بشب زہرہ و مہ قنادیل سقف	بود پیشکارش بہ روز آفتاب
ز غالب چو پرسیدہ شد سال آں	چنیں گفت آن رند خانہ خراب
ازاں رو کہ بزم عیش و نشاط	ز بخشش جہانی تو د کامیاب
چو بینی طرب را نہایت نماند	بود سال آں بخشش بیحساب"
خدایا! بپسند خداوندگار	کہ از طبع غالب رد و پیچ و تاب

(۲) خط میں تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے لفافے سے اضافہ کی ہے۔
(۳) میرزا صاحب نے سو نجا لکھا ہے۔ اسی طرح خط نمبر ۵۳ میں بھی سونچ لکھدیا ہے۔
(۴) صاحبزادہ محمد حسن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے اور نواب خلد آشیاں کی صاحبزادی حیات النساء بیگم ملقب بہ عالیہ سلطان بیگم کے شوہر تھے۔ (اخبار الصنادید: ۲/ ۲۳۰) انھوں نے عین عالم جوانی میں انتقال کیا۔ نواب خلد آشیاں کے لیے یہ واقعہ بہت روح فرسا تھا، اسی لیے میرزا صاحب نے اس قدر پر اثر تعزیت نامہ ارسال کیا ہے۔

(۵) یہ مصرع میرزا صاحب کے ایک فارسی قطعے کا دوسرا مصرع ہے۔ پہلا مصرع یہ ہے۔ "دو شد عزقہ بجوں بیکر شاہ سہدا بزے"۔ ملاحظہ ہو کلیاتِ نظم فارسی۔ ۲ ستمبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط موسومہ نواب میر غلام بابا خاں رئیسِ سورت میں بھی نواب میر جعفر علی خاں کے بعمر ۴۶ سال فوت ہو جانے پر افسوس کرتے ہوئے میرزا صاحب نے اسی مصرع دہرایا ہے۔ ملاحظہ ہو اردوئے معلیٰ: ۲، طبع لاہور۔

صفحہ ۷۱

(۱) علی بخش خاں خانساماں کے سلسلے میں چھبیسویں عریضے کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔
(۲) میرزا صاحب نے سو روپیے لکھ دیا ہے۔

صفحہ ۷۲

(۱) صاحبِ عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا ابن میرزا کریم الدین رسا دلی کے شاہی سرا دے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ رجب سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب فردوس مکاں کی طلب پر رامپور تشریف لائے، اور یہیں سنہ ۱۳۰۴ھ میں نواب خلد آشیاں کی وفات کے ۸ دن بعد ۹۴ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ انھیں شعر و شطرنج کا بہت شوق تھا۔ میرزا صاحب نے ان کے دیوان کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے گلستانِ سخن (۲۰۷) اور خمخانہ (۲: ۵۱۰) ملاحظہ ہو۔
(۲) میرزا رحیم الدین بہادر حیا کے پوتے رامپور میں بقیدِ حیات ہیں۔ انھوں نے بھی کامل شطرنج باز کے حالات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔
(۳) ان صاحبزادی کا نام اور ان کے والد کا نام اگلے خط میں خود میرزا صاحب نے لکھ دیا ہے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے بھائی کا نام نبی بخش خاں تھا اور یہ کہ ان صاحبزادی کے نانا جنرل آکٹر لونی، جو مسلمانوں میں اختر لونی مشہور تھے اور نانی ایک مسلمان بی بی مبارک بیگم نامی تھیں۔ مبارک بیگم نے بازار سرکی والان (قاضی حوض، دہلی) میں سنگ سرخ کی ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جو سنہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) میں بن کر تیار ہوئی اور آج تک "لال مسجد" کے نام سے مشہور ہے (ذکرِ غالب: ۳۰۷، بحوالہ واقعاتِ دار الحکومت دہلی: ۲، ۳۲۹)
(۴) اصل "ہات"

صفحہ ۷۳

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۲۹ اگست درج ہے۔ لیکن یہ سہوِ قلم معلوم دیتا ہے، کیوں کہ ڈاک خانے کی مہر میں بھی ۱۹ ہی درج ہے۔ نواب خلد آشیاں نے ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۸ اگست سنہ ۱۸۶۷ء) کو جواباً تحریر فرمایا: "... چونکہ مفاوضۂ بہجت طراز سے منشای خاص آپ کا بخوبی منکشف نہ ہوا، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ خلاصۂ مکنونِ خاطرِ محبت مظاہر سے مطلع کیجیے، کہ بمقتضای انضباطِ روابطِ موالستِ قدیمہ جو بات کہ ممکن ہوگی، وہ ظہور میں آئے گی۔ خاطر جمع رکھیے"۔
(۲) ذکرِ غالب (ص ۳۰۷) میں ان کا نام خورشید بیگم لکھا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے، تو

غالباً خورشید بیگم عرف ہوگا۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "..... چون کہ آن مشفق تعدادِ مصارفِ شادیٔ مجوزۂ خود تحریر نہ نمودہ اند، لہٰذا حوالۂ خامۂ محبت نگار میشود کہ اول از تعدادِ مصارفِ شادیٔ مطلع نمایند کہ بعدِ دریافتِ آن درین خصوص تجویز مناسب بعمل خواہد آمد، چراکہ بمقتضای موانست و اتحادِ قدیمہ راقم راخوشنودیٔ آن مہربان در امورِ مناسبہ مدِ نظر است ..... المرقوم ۱۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء

صفحہ ۴۷

(۱) سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی سنہ ۵۱۱ھ (۱۱۱۷ء) میں تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ یہ بڑا اولوالعزم اور صاحبِ جود و کرم بادشاہ تھا۔ اس کا ابتدائی عہدِ حکومت، فتوحات کی وسعت کی بدولت، تاریخ کا روشن باب ہے۔ علم و ہنر اور شعر و سخن کا بھی بڑا قدر دان اور مربی تھا۔ رشید وطواط اور انوری وغیرہ، اس کے درباری شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس نے کاشانۂ انوری کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے دوبار شرف بخشا۔ آخر میں ترکمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا تھا۔ وہاں سے بدقت آزاد ہوا، تو ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۵۵۲ھ (۱۱۵۷ء) کو دستِ قضا نے پکڑ لیا۔

(۲) شاہجہاں ہندوستان کے مغل سلاطین کا پانچواں حکمران تھا۔ ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں رانی بالمتی، دخترِ راجہ اودے سنگھ والیٔ جودھپور کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۳۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں مسندِ حکومت پر قدم رکھا۔ اور سنہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں عالمگیر اورنگ زیب کے حق میں تاج و تختِ ہند سے دست بردار ہوکر آگرے کے قلعے میں جا بسا۔ موجودہ دلی اسی کی آباد کی ہوئی ہے۔ بڑا سخی، دانا اور شہرۂ آفاق قدر دانِ علم و ہنر بادشاہ گزرا ہے۔ دلی کی مسجدِ جامع اور لال قلعہ، اور آگرے کے عدیم النظیر روضۂ تاج محل کا بانی ہے۔ اس کی قدر دانی اور قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ محمد جان قدسی اور کلیم ہمدانی کو قصیدوں کے صلے میں روپیوں سے تلوا دیا۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں ساڑھے پانچ ہزار روپے بھر نکلے۔ قدسی کو دوبار خلعت اور دو ہزار روپے عطا ہوئے۔ کلیم کو جشنِ وزنِ شمسی کی تقریب میں ۱۰ ہزار روپے کا صلہ عطا کیا۔ بعض شاعروں کے منہ ہیرے اور موتیوں سے بھر دیے۔ اس نے آگرے میں سنہ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں وفات پائی اور تاج محل میں اپنی بیوی کے برابر مدفون ہوا۔

(۳) باقر علی خاں کے لیے دیباچہ، بحث خاندانِ سبلی ملاحظہ ہو۔

(۴) میرزا صاحب نے "کرتا ہے" لکھا ہے۔ لیکن یا تو "کرتا ہوں"، ہونا چاہیے اور یا "کرتی ہے"، چونکہ میرزا صاحب تمام دلی والوں کی طرح مرکب مصادر میں جزوِ اول کی تانیث کی صورت میں علامت مصدر "نا" کو "نی" سے بدل دیتے ہیں اسلئے خبر کرد نکب "ہوں" کی جگہ "ہے" سہواً لکھ گیا ہے۔

رباعی کو قطعۂ مبارکباد لکھنا کتابت کا سہو ہے۔

صفحہ ۸۰

(۱) عریضے کے لفافے پر "دوشنبہ نہم مارچ سنہ ۱۸۶۸" درج ہے۔

(۲) کاغذ سے ہنڈوی مراد ہے۔

(۳) عریضے میں کاتب کا نام اور تاریخ کتابت دونوں درج نہیں۔ لفافے پر میرزا صاحب نے دوشنبہ ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء تحریر کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ ڈاک خانے کی انگریزی مہر میں ۱۱ مئی درج ہے، ثانیاً اس لیے کہ عریضے میں تنخواہِ اپریل کی اطلاع دی ہے اور یہ مسلم ہے کہ اپریل کی تنخواہ اپریل میں نہیں ملتی، مئی میں ملتی ہے، اس لیے اس کو ۱۱ مئی سنہ ۶۸ء کا ہونا چاہیے۔

(۴) میرزا صاحب نے سہواً ۱۸۶۷ لکھ دیا ہے۔ صحیح تاریخ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸ء ہے، اس لیے کہ اولاً تو جون سنہ ۶۸ء کے نوشتہ عریضے میں اس کی رسید طلب کی ہے، اور اس میں اس خط کو "سابق کا عریضہ" لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں عریضوں کے درمیان کسی تیسرے عریضے کا فصل نہیں تھا، ثانیاً اسی عریضے کے لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا حسب ذیل نوٹ ہے: "تصویر بعد ملاحظہ سپرد رسید مجاور علی صاحب شد۔ ۲ جون سنہ ۱۸۶۸ء" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۶۸ء کا ہے۔ اگر سنہ ۶۷ء کا ہوتا تو اسی سال میرزا صاحب تقاضای رسید کرتے، اور اسی وقت سرکار بہ تصویر ملاحظہ فرما کر سید مجاور علی صاحب کو دیتے۔

صفحہ ۸۱

(۱) نواب صاحب نے جوابی فرمان مورخہ ۷ جولائی سنہ ۶۸ء میں تحریر فرمایا ہے: "شبیہ آن شفق وصولِ شادمانی آوردہ از نظرِ محبتہا منظور شد۔" اس تصویر کے علاوہ میرزا صاحب نے جہاں جہاں اپنی تصویریں بھیجی تھیں، اُن کے لیے اردوی معلّیٰ (ص ۲۰، ۴۳، ۴۴، ۱۲۶، ۲۳۷، ۲۴۷) ملاحظہ ہو۔

(۲) اس عریضے میں صرف (طالب غالب) میرزا صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ نیز کاتب نے بجائے دلجمی کے دلجی لکھا ہے! اسیرِ شالباً میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی۔

(۳) یہاں لفظ "میں" ساقط معلوم ہوتا ہے۔

(۴) مظفر حسین خاں بہادر ابن مسیح الدولہ حکیم علی حسن خاں بہادر جاوید جنگ ابن حکیم الملوک میرزا علی خاں بہادر لکھنوی نواب خلد آشیاں کے مصاحب تھے۔ ان کے والد مسیح الدولہ شاہ اودھ کے طبیبِ خاص تھے۔ سلطنتِ اودھ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد یہ خاندان بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ رامپور اُس زمانے میں صاحبانِ علم و ہنر کا ملجا و ماویٰ تھا۔ مظفر حسین خاں اور اُن کے بھائی احسان حسین خاں نے بھی سنہ ۱۸۶۷ء میں اس دربار دربار کا قصد کیا۔ نواب خلد آشیاں نے ان دونوں کی کماحقہٗ قدر و منزلت کی۔ مسیح الدولہ صاحبِ علم اور ایک نہایت عمدہ ذخیرۂ مخطوطات و مطبوعات کے مالک تھے، جو اُن کے انتقال کے بعد اُن کے دونوں بیٹوں کو وراثت میں ملا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کی

ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا شبلی نے یہ کتاب خانہ دیکھا تھا اور وہ اس کی جامعیت
اور ندرت کے بیحد معترف تھے۔ مظفر حسین خاں سے نواب صاحب نے اس ذخیرے کا
ایک معقول حصہ خرید کر سرکاری خزانۂ کتب میں شامل فرمایا تھا۔ ان کتابوں پر مظفر
حسین خاں کے دستخط ثبت ہیں۔ اور متعدد نسخوں پر جابجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ خود
ان کے اپنے مصنفہ متعدد رسالے بھی کتب خانے میں موجود ہیں۔ یہ عربی زبان میں
فلسفہ و حکمت پر لکھے گئے ہیں۔ میرزا صاحب سے ان کے روابط تھے۔ جب رامپور
آئے، تو میرزا صاحب نے منشی سیلچند سے ان کی درباری قدر و منزلت کے متعلق
استفسار کیا تھا۔ ... ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱۲۷۔
احسان حسین خاں نے ۵ رجب سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو کربلائے معلیٰ میں
انتقال کیا (کلیات منیر: ۵۳۵) اور مظفر حسین خاں سنہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں
فوت ہوئے (ایضاً: ۵۴۷)

صفحہ ۸۲

(۱) اس خط میں خلافِ دستور میرزا صاحب نے دعائیہ شعر نام اور تاریخ کے بعد لکھا ہے۔

صفحہ ۸۳

(۱) یہ بحث انگریزی تنخواہ کو آمدنی میں شامل کر لینے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سنہ
ماہی سود کے علاوہ بھی صرف ڈیڑھ سو روپے شاگرد پیشہ ہی کے رامپور کے سو روپے ہیں
سے منہا کر دیے جائیں، تو ۳۲ روپے بچتے ہیں۔
(۲) شاگرد پیشے کی تنخواہ کا ذکر عریضہ ۱۰ میں بھی گزر چکا ہے۔
(۳) اصل میں سود کی دال ساقط ہے۔ اسی سنہ ماہی سود کی مقدار کے متعلق سرور کو لکھا ہے:
دو تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ لہٰذا ادائے قرض سے بچے، اب ماہ بماہ روپیہ ملتا
ہے۔ مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء میں تنخواہ ششماہی
ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپیہ سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا
اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپیہ مہینا آیا۔ ہے ۹ کے ساڑھے رہیں گے۔
کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گزارا
ہو جاتا ہے۔" (اردوئے معلیٰ: ۱۰۴، لاہور ایڈیشن)

صفحہ ۸۴

(۴) لفافے کی پشت پر لکھا ہے: "پیش نمودہ شد۔ ہنوز حکمے صادر نگردید۔ ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء"
(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء درج ہے، حالانکہ ڈاک خانے کی مہر کے اندر
بھی ۲۰ تاریخ ہی مندرج ہے۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ سہواً لفافے پر ۱۵ دسمبر لکھا گیا
ہے۔ لفافے کی پشت پر لکھا ہے: "پیش نمودہ شد۔ حکم صادر نشد۔ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء"
(۲) اس لفافے کو مندرجۂ عریضہ اس اور عریضے کی بنا پر "قرضخواہ ہوں" لکھا ہے
(۳) اصل میں ۱۲۷۸ لکھا ہے۔ اور لفافے پر دہم جنوری سنہ ۱۸۶۹ء تحریر ہے۔ یہ میرزا صاحب
کی آخری تحریر ہے۔ حسین علی خاں کے عریضے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری کی تنخواہ

۱۵ فروری کو میرزا صاحب کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل پہنچی تھی اس لیے اُس کی رسید اپنے قلم سے نہ لکھ سکے۔ سویم کے روز حسین علی خاں نے سرکار کو میرزا صاحب کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: "بتاریخ ۱۵ فروری سنہ حال مطابق ۲ ذیقعدہ روز دوشنبہ وقت ظہر جناب دادا جان صاحب قبلہ نواب اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ صاحب نے اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ فدوی کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کس قدر رنج والم اس سانحہ جانگزا و جگر خراش سے لاحق ہوا ہے۔ اور نیز جناب دادی صاحبہ معظمہ کا حال اس رنج سے عالمِ پیری میں ایسا ہو گیا ہے کہ گذارش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضور کا نوازش نامہ مع ہنڈوی یک صد روپیہ بابت تنخواہ جنوری سنہ ۶۹ء کے ۱۵ فروری کو ایک گھنٹہ پہلے انتقال دادا جان صاحب سے شرفِ صدور لایا تھا۔ رسید ہنڈوی واسطے اطلاعِ حضور کے عرض کی گئی۔"

فروری کے چودہ دن کی تنخواہ کی رسید حسین علی خاں نے ۱۱ مئی سنہ ۶۹ کو اپنی مہر لگا کر دہلی سے روانہ کی تھی، جو اُن کے خطوط کے فائل میں منسلک ہے۔ مگر اُن کے مکتوب بنام سلیمؔ بند سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶ ماہِ مذکور تک تنخواہ کی ہنڈوی انھیں نہیں ملی تھی ۲۱ صفر ۱۲۸۶ھ کے ایک نوٹ سے پتا چلتا ہے کہ اُس تاریخ سے قبل رقم یہاں سے بھیجدی گئی تھی۔ یہ تاریخ ۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کے مطابق ہے حسین علی خاں نے اپنے ۱۲ جون کے عریضے میں اس کے وصول کا ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۸۵

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے لفافے پر لکھی تھی۔

صفحہ ۸۶

(۱) چیف کمشنر سے لارڈ لارنس مراد ہیں، جو ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۴ء تک پنجاب کے چیف کمشنر اور بعد ازاں وایسرائے ہندوستان بنا دیے گئے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۶۶

(۲) کمشنر دہلی سے چارلس سانڈرس مراد ہیں۔ ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

(۳) اس زمانے میں دہلی کے کلکٹر فلپ ہنری اجرٹن، آئی، سی، ایس تھے، یہ ۹ اگست سنہ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں ہندوستان آئے۔ شمال مغربی صوبے میں سنہ ۱۸۵۰ء تک خدمات انجام دیں سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۵۹ء تک دہلی کے مجسٹریٹ اور کلکٹر رہے لیکن سنہ ۵۷ کے محاصرۂ دہلی میں رخصت پر تھے۔ اکتوبر سنہ مذکور میں واپس آکر بڑی مضبوطی سے شہر اور ضلع میں امن وامان کو بحال کیا۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں امرتسر کے کمشنر مقرر ہوئے، سنہ ۱۸۶۸ء میں راولپنڈی تبادلہ ہوا۔ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۹۳ء تاریخ انتقال ہے

(۴) اس لفظ کو میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن صحیح "ریونیو بورڈ" ہے۔

(۵) اس سلسلہ میں جو ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا ہے: "وہ عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اُس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمۂ سائل کے پاس بھیجدی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی

میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اُس میں ملفوف کرکے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔

اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے یہاں گیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اُس حکم کے نہیں کی۔ پرسوں تو اُن کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے، جو اُس کو دیکھیں گے۔

بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ سمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

بھائی، بدایت تو اچھی ہے، نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور اجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اُس حکم پر خط میرے نام آیا ہے حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملہ نے خط لکھا صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔" (اردوی: ۸۵، لاہور ایڈیشن؛ خطوط ۱: ۳۱۱)

صفحہ ۸۷

(۱) لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اسے لکھ تو ۲۴ تاریخ ہی کو لیا تھا، مگر ارادہ تھا کہ ۲۵ کو پوسٹ کرائیں گے، اس لیے ۲۵ مارچ تاریخ لکھ دی تھی، لیکن بعد ازاں ازراہِ عجلت ۲۴ ہی کو ڈاک میں ڈلوا دیا۔ اصل عبارت یہ ہے: "در شہر الور موصول و بخدمت نواب صاحب مشفق و مکرم، مظہر لطف و کرم، نواب زین العابدین خاں صاحب عرف کلن میاں سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد، از غالب بیرنگ، بیرنگ۔ مرسلہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء۔ ضروری۔ جواب طلب و شتاب طلب ۱۲ جون عجلت در ارسالِ مکتوب می بایست، ہم بروز چہار شنبہ آخر روز ۲۴ مارچ فرستادہ شد۔"

(۲) یہ خط میرزا صاحب نے زین العابدین خاں کے اصل خط کے حاشیے پر نقل کر کے منشی سیل چند صاحب کو بھیج دیا تھا۔ زین العابدین خاں کے خط کی عبارت یہ ہے: "نواب صاحب مشفق مہربان، کرمفرمای دوستان، مجموعۂ خوبیہای بیکران، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون و اشتیاقِ ملاقاتِ مسابہجت مشحون، یہ چند خزف ریزے بھیج کر تکلیف دیتا ہوں کہ نگاہِ گوہر سنج سے ملاحظہ کرکے اغلاطِ محاورات، و تراکیب، و سستی بندش و تعقیدات صوری و معنوی، و تنافر الفاظ، و ابتذال مضامین، جس جگہ واقع ہو مطلع فرمائیے۔ فقط۔ امر مستفسرۂ سابق بیں صدورِ مہربانی نامۂ نامی نے خلجان رفع کیا۔ جواب اس کا بھی اگر جلد عنایت ہو، بعید از ارتباطِ دیرینہ سے نہ ہوگا۔ زیادہ شوق و بس۔ فقط۔ نگاشتہ دہم مارچ سنہ ۶۵ء از مقام جے پور۔

صفحہ ۸۸

(۱) یہ خط دیوانِ بیتاب قلمی کے ورق ۸۴ الف کے حاشیے پر میرزا صاحب نے لکھا ہے آخر میں تاریخ نہیں ہے۔ لیکن دوسرے خط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء سے قبل لکھا گیا تھا۔

صفحہ ۸۹

(۱) دیوانِ مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۹۰

(۱) دیوانِ مطبوعہ میں "میں بھی" ہے۔

صفحہ ۹۱

(۱) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
(۲) مطبوعہ میں دوسرا مصرع یوں چھپا ہے: "میں تم پہ مبتلا ہوں، وہ ہے مبتلای شمع"۔
(۳) مطبوعہ: "ہیں زخم اور آبلہ"۔
(۴) مطبوعہ: "جب قابلِ بیاں ہی نہ اپنا رہا قلق"۔

صفحہ ۹۲

(۱) مطبوعہ: "پھوڑا ہوا ہے پک کے"۔
(۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ دیوانِ مطبوعہ اور اُس قلمی نسخے میں جو میرزا صاحب کے اصلاحی نسخے سے منقول ہے، یہ غزل نہیں ہے۔
(۳) دیوانِ مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔
(۴) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
(۵) مطبوعہ: "لکھیں نہ نامے ہیں"۔ دراصل قلمی نسخے میں یہ اصلاح غالباً خود بیتاب نے کی ہے۔

صفحہ ۹۳

(۱) مطبوعہ: "قتل کا اپنے خوش آیا ہے۔ یہ ایما ہم کو"۔ یہ بعد کی ترمیم معلوم ہوتی ہے۔
(۲) مطبوعہ: "جوشِ وحشت میں ہوں کیوں ننگ میں عریانی کا"۔ یہ بھی بعد کی ترمیم ہے۔
(۳) میرزا صاحب کی یہ اصلاح درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ "مقتضی"، مصدر "اقتضا" کا اسم مفعول ہے، اور جمع اس کی "مُقتَضَیات"، بفتح یا بغیر تشدید ہوگی، نہ کہ "مُقتَضَّیات" جیسا کہ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ میں مصرع اس طرح درج کیا گیا ہے: مقتضای بستری ہے تو نہ تھا صبر مگر۔
(۴) مطبوعہ: "لگا"۔
(۵) مطبوعہ میں یہ غزل ردیف نون میں درج کی گئی ہے۔ مگر مطلع کی حسبِ ذیل صورت ہے:
عبث ہیں خونفشاں یہ دیدہ و مژگاں نزدونوں ۔ فغان و نالہ ہیں تو ہوں، مگر ہیں بے اثر دونوں

صفحہ ۹۴

(۱) مطبوعہ: "رکھے منہ کیوں کر وہ میرے سینۂ پُر داغ پر"۔
(۲) مطبوعہ: "توڑ کر"۔

(۳) مطبوعہ: "حشر کے دن تو بھی اس سے ایک صحبت اور سہی۔"

(۴) مطبوعہ: "خم ہے یہاں گردن"

(۵) مطبوعہ میں یہ شعر اسی طرح باقی رکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۵

(۱) یہ خط دیوان کے آخری سادہ صفحے پر لکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۶

(۱) مطبوعہ میں یہ شعر نہیں ہے۔

(۲) مطبوعہ میں اس مطلع کو اس طرح چھاپا گیا ہے: "غیبت ہے زباں پہ اپنی تو کہ نقش نہ ہے
یہی چرچا کیجے ما، مجھ کو اے ناصح، تو جس آتا ہے"

(۳) مطبوعہ: "وہم ہے آفت"

(۴) مطبوعہ: "ہو گیا"

صفحہ ۹۷

(۱) مطبوعہ: "یا محو نم رہے منتی میں دکام آئے تھے"

(۲) مطبوعہ: "ملا کر خاک میں بس حلد ب دوہ"

(۳) مطبوعہ: "عشاق"

صفحہ ۹۸

(۱) بیتاب کا اس زمین میں دو غزلہ ہے مگر یہ قافیہ یا اس مضمون کا شعر انھوں نے نہیں لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اپنی عادت کے خلاف پورا شعر خود کہہ کر لکھ دیا ہے۔

(۲) مطبوعہ میں یہ شعر اس طرح درج ہے: "کوئی اللہ سے مانگ لائے اک ذرا سا صبر بیتاب کے نام سے"
ہارڈ الابیزاری نے "ادنیٰ" نہیں آیا، لکھا ہے کاتب نے "وہی"

(۳) دراصل میرزا صاحب کی سمجھ میں صرف لفظ "ادنیٰ" نہیں آیا تھا، لکھ دیا تھا، ورنہ مصرع کے اور تمام لفظ صاف صاف تحریر ہوئے ہیں۔

(۴) مطبوعہ: "تھا بہت شوقِ ملبس، لیکن ادب مانع ہوا"

صفحہ ۹۹

(۱) مطبوعہ: "عاشق ہیں، بآسانی اگر قتل کرے گا"

صفحہ ۱۰۰

(۱) بیتاب نے بھی غلط نہیں لکھا ہے۔ اصلاح کا منشا صرف حسنِ کلام بڑھانا ہے۔

(۲) مطبوعہ: "بغیر اس کے پیوں خونِ دل، یہ مے ساقی"

صفحہ ۱۰۱

(۱) اصل میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے: "دو نیکوں کی تہہ جھکی زمین سر کچھ تو دیر کی"

صفحہ ۱۰۲

اصل میں مصرع کا پہلا لفظ "زمین ہے" اور لفظ "آج" کاتب سے رہ گیا ہے۔

...عہ: "طبانچہ"

(۳) مطبوعہ میں یہ قصیدہ نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۴

(۱) میرزا صاحب نے آراستگی پر اسی طرح اعراب لگائے ہیں۔ مگر مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔
(۲) مطبوعہ: "پہنچتی ہے"
(۳) یہ کتابت کی غلطی ہے۔
(۴) مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۰۵

(۱) مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔
(۲) مطبوعہ: "آگاہ تو ہے"
(۳) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

صفحہ ۱۰۶

(۱) مطبوعہ میں یہ شعر نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۷

(۱) مطبوعہ: "عدو کے پر بتانے کی نہیں ہے"
(۲) مطبوعہ: "تو اُن کو کرے پیار"
(۳) مطبوعہ میں یہ رباعی نہیں ہے۔
(۴) یہ کتابت کی غلطی ہے۔
(۵) اصل: "مظلومین" یہ کتابت کی غلطی تھی۔ در اصل اُسے مظلومی لکھنا چاہیے تھا، جس سے مظلوم ہونا مراد ہے۔ میرزا صاحب مظلوم کی جمع مظلومین سمجھے۔ چونکہ یہ لفظ غیر موزوں سا تھا، انھوں نے "مقتولوں" سے بدل دیا۔ حالانکہ زیادہ موزوں وہی "مظلومی" ہے۔

صفحہ ۱۰۸

(۱) یہ غزل میرزا صاحب کی اُس غزل کی ہم طرح ہے، جس کا مقطع ہے: اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب!۔ آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے۔ پوری غزل کے لیے غالب نامہ ۴۰۔۴۸ طبع دوم ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۱۰۹

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کے لفافے پر لکھی تھی۔

صفحہ ۱۱۰

(۱) یہ خط نواب فردوس مکاں کے غسلِ صحت کی تاریخ کے متعلق لکھا گیا تھا۔ سرکار کے مرض اور افاقے کے متعلق عرائض ۴۶ تا ۴۸ اور اُن کے حواشی ملاحظہ ہوں۔
(۲) منشی صاحب نے میرزا غالب کے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۶۴ء کے جواب میں جو خط تحریر کیا تھا، اُس میں ذکرِ ماہِ جشن کے بعد درخواست کی تھی کہ "ایک مادہ تاریخ کا ندوی نے نکالا ہے، مو عرض کرتا ہوں۔ امیدوار ہوں کہ اُس کے دو شعر موزوں

فرماکر عنایت نامہ موسومہ فدوی کے ہیں عنایت فرمائیے:

کاٹ کر سرِ اعدا عرض کر تو' اے منشی بندگانِ عالی کا آج غسل صحت ہے

اس شعر کا مصرعِ ثانی مادۂ تاریخ ہے۔ چونکہ اس کے اعداد ۱۲۸۶ ہوتے ہیں' اس لیے ایک عدد کا تخرجہ کیا گیا ہے۔ فقرہ (کاٹ کر سرِ اعدا) بتاتا ہے کہ اگر سرِ اعدا یعنی حرفِ الف کے عدد کو' جو ایک ہے' مادۂ تاریخ میں سے کم کر دیا جائے' تو اعدادِ مطلوبہ ۱۲۸۵ حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ یہ امر قاعدۂ تاریخ گوئی کے عینِ مطابق ہے' اس لیے میرزا صاحب نے اس پر جو اعتراض کیا ہے' وہ درست نہیں۔

(۳) قصیدۂ تہنیت عریضۂ نمبر ۴۴ کے حاشیے میں درج ہے۔

(۴) شاہ کبیر الدین صاحب سہسرام کے ایک بزرگ تھے۔ مزید حالات کا پتا نہیں۔

(۵) میرزا صاحب نے سہواً ماہِ آیندہ کو رجب لکھ دیا ہے ورنہ فی الواقع اگلا مہینا رمضان کا تھا اس لیے کہ عریضہ ۴۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۱۳ دسمبر کو رجب کی بھی ۲۳ تاریخ تھی۔ لہٰذا ۱۹ جنوری کو' ۱۹' یا ۲۰ شعبان ہو گی' اور شعبان کے بعد رمضان آتا ہے' رجب نہیں آتا۔

صفحہ ۱۱۱

(۱) زین العابدین خاں کا خط میرزا صاحب کے مکتوب (۱۲۰) کے حاشیے میں نقل ہو چکا ہے

(۲) عریضۂ نمبر ۴۴ مراد ہے

(۳) سفرر: ضرور۔

(۴) یہ عریضہ کلیاتِ نثر فارسی میں شامل نہیں ہے' اس سے گمان ہوتا ہے کہ رامپور سے نقل روانہیں کی گئی۔

(۵) اس کے آخر میں میرزا صاحب نے اپنا نام اور تاریخ کتابت کچھ نہیں لکھا ہے۔ پشتِ ورق پر کسی اہلکار دارالانشا نے حسبِ ذیل یادداشت لکھی ہے: "قصیدہ ہای شاعران مرسلۂ مرزا نوشہ صاحب ۲۹ رجب سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی ۱۵ یا ۱۶ کو میرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہو گا۔ خط کا لفافہ ضائع نہ ہو جاتا' تو تاریخ کا واقعی علم ممکن تھا۔

صفحہ ۱۱۲

(۱) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی' سید عبدالحی عرف میر سید احمد احمد تخلص کے بیٹے اور حکیم حاجی مولوی سید غلام یحییٰ کے پوتے ہیں۔ نسب میں حسینی سید اور بلگرام کے باشندے ہیں۔ اپنے نانا کے گھر مارہرے میں پیدا ہوئے۔ "شمس الضحیٰ" سے سالِ ولادت ۱۲۴۹ھ نکلتا ہے۔ رشحاتِ صفیر (صہ ۱۹' مطبع نور الانوار' آرہ' ۱۲۹۳ھ) میں خود اپنا حال اس طرح لکھا ہے:

" خالقِ بے ہمتا نے قصبۂ مارہرہ ضلع کول میں مجھے خلعتِ میلاد دیا' جو میرے نانا حضرت شاہ عالم صاحب علیہ الرحمہ' سجادہ نشینِ مارہرہ کا مسکن ہے' جن کو حضرت غالب دہلوی نے پنج آہنگ اور اردوی معلّی وغیرہ میں پیر و مرشد کر کے یاد کیا ہے' اور قصبۂ بلگرام کو

میرا وطن کیا، جو صوبہ اودھ میں نام برآوردہ اور معدنِ علم دفن ہوتا آیا ہے، اور شیخ اتان علی سحر اور میرزا سلامت علی دبیر لکھنوی اور مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا شاگرد اور شیخ امداد علی بحر لکھنوی کا مقلد اور میر مظفر علی اسیر لکھنوی کا معتقد ہے مگر آب و دانہ پانچ برس کی عمر میں مجھے قصبۂ آرہ ضلع شاہ آباد، قریب عظیم آباد پٹنہ کے لایا۔ اور شوقِ علم نے ہمیشہ اس زاد بہ نشین نادانی کو اکثر بلاد و امصار میں صورتِ پرکار پھرایا۔ بارہا لکھنؤ کی سیر کی، دہلی گیا۔ اساتذۂ سابق سے سابقہ رہا۔"

استادِ من بشیوۂ اردو زبان سحر	کز ناسخ است یافتہ تمغای شاعری
در مرثیہ دبیر بود او ستادِ من	مقبولِ کبریا شدہ از مدحِ حیدری
غالب بود ہنر و رِ شعرم بپارسی	کو ہست در زمانہ علم با ہنروری

(ایضاً: ۱۲)

میرزا صاحب نے رشحاتِ صفیر کی تقریظ میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:
"سیدی، سندی، نورِ بصر، لختِ جگر، قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طولِ عمر و دوامِ دولت و بقای اقبال کی دعا مانگتا ہوں، جن کو مبدءِ فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ سبحان اللہ! تفرقۂ تذکیر اور تانیث کی تقریر کردہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی ہے۔ ہر چند اس راہ سے کہ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں، قواعدِ تذکیر و تانیث کے منضبط ہونے کے خود معترف ہیں، لیکن قوتِ علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں کہ مجھے دل سے پسند آتے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظورِ انظار اولوالابصار رہے گا۔ جو صاحب اس کو مطالعہ فرمائیں گے نفع بھی پائیں گے، اور لطف بھی اٹھائیں گے۔ مؤلف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں، سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرات کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے، جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے۔

مادحِ خورشید مدّاحِ خودست | کہ مرا دو چشم سرنام مُدا ست

الراقم ۱۲۸۴ھ
اسد اللہ

داد کا طالب غالب

صفیر نے ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں انتقال کیا (خمخانہ: ۵، ۳۹۴، "تاریخ لطیف ۱۶۳)

اس قصیدے کے ہر شعر کا پہلا حرف ملایا جائے تو "نواب مستطاب معلی القاب جناب نواب کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ والیِ رام پور" بنجاتا ہے۔ اسی کا نام صنعتِ توشیح ہے۔ حاشیے کا حلِ لغات خود صفیر کا نوشتہ ہے۔

قصیدہ بہ صنعتِ توشیح در مدحِ نواب مستطاب معلی القاب جناب نواب کلب علی خاں بہادر دام اقبالہٗ والیِ رامپور

نویدِ ساقیِ رنداں کہ ہے طرب کا ظہور ۔۔۔ لنڈھا دے شیشۂ صہبا پلا دے جامِ سرور
وہ اٹھا ابر وہ بادل چلے برسنے کو ۔۔۔ وہ بیٹھا خانۂ رنج و الم بفضلِ غفور
اڑی نقاہتِ نرگس بڑھی وجاہتِ گل ۔۔۔ کھلی صباحتِ نسریں کھلی ملاحتِ سورا
بہار جلیش میں ہے پھولوں کے یہ رنگ ہے آج ۔۔۔ ہزار علیش میں ہے وصلِ گل ہے کل کل دور
مرا بھی خانۂ دل نقشہائے رنگیں سے ۔۔۔ بنا ہے صنعتِ معمارِ طبع سے معمور
سبب نہ پوچھ کہ دل کیوں ہے خانہ بلاغ طرز ۔۔۔ جہت نہ ڈھونڈ کہ ہے شش جہت میں کیوں یہ سرور
تجھے ہو آج مبارک یہ دور دورِ شراب ۔۔۔ تجھے ہو آج مزا وار عیش کا منہ کور
طرب طرب نہ کہے کھل کے کس لیے غنچہ ۔۔۔ کہ آج مسندِ دولت ہے نور سے معمور
امارت آج ہے نازاں کہ زیبِ مسند ہیں ۔۔۔ جناب کلب علی خاں غیور ابنِ غیور
بنایا دورِ فلک نے زمین کو رشکِ ارم ۔۔۔ کہ رامپور ہوا ہے تمام دارِ سرور
میں اس خوشی میں پڑھوں اب اک مطلعِ رنگیں ۔۔۔ کہ جس کے لکھنے کو آئے بیاضِ دیدۂ حور

مطلع

عنایت اس کی نہ جب ہے اگر نظامِ امور ۔۔۔ تو میلِ دیدۂ سلطاں ہو خانۂ دستور
لیاقتِ ازلی سے ہے مطمئن عالم ۔۔۔ ق ۔۔۔ جلالتِ ابدی سے ہیں منتشر جمہور
یہ اس لیے ہے کہ ایذا نہ دے کسی کو کوئی ۔۔۔ وہ اس لیے ہے کہ کرنے ظلم ان کی حد سے دور
اسیرِ دامِ خطِ دست میں ہے دزدِ حنا ۔۔۔ تو چورِ شمع کا گلگیر نے کیا محصور
لوائے عدل ہوا سایہ افگنِ سرِ خلق ۔۔۔ ہما کے سایے کے خواہاں نہیں ہیں اب جمہور
قلوبِ خلق ہیں یوں اس کے حکم سے خورسند ۔۔۔ کہ جیسے روح کو ہو انتعاشِ طلعتِ حور
اس انتظام کو دیکھیے یہ عدل ہے نایاب ۔۔۔ زمیں پر ایک جگہ ہے مقامِ سایہ و نور
بری ہیں درد و غم و رنج سے تمام قلوب ۔۔۔ ہوئے ہیں فرطِ بشاشت سے دل بری سرور
جمال و حلم سے امید ہیں غنی و فقیر ۔۔۔ جلال و رعب سے دہشت میں قیصر و فغفور
مہیبِ عدل اگر رو کے ظلمِ حادثہ کو ۔۔۔ بری ہو نامِ یتیمی سے گوہرِ منثور
اشارہ ہو جو ذرا عدلِ ذہرِ اقدس کا ۔۔۔ کاعث ہو ماہ سے زائل تو آفتاب سے نور
بلند عدل کا پایہ ہوا یہ ان کے سبب ۔۔۔ ق ۔۔۔ کہ اب ہے فکرتِ کسریٰ پہنچنے سے معذور
نیابت ان کی کرے آ کے ہاں اگر کسریٰ ۔۔۔ یقین اتنا تو ہے بعدِ انقضائے دہور
وہ پہنچے نہ رتبۂ اول پہ عدل کے لیکن ۔۔۔ جو اور قصد پہ ہو گام سنج کیا مقدور
اٹھائے چوبِ ادب سر پہ اس کے تختہ زیب ۔۔۔ بٹھائے مہرِ جلالت کے سایے میں گے سے عور
ہدایت اس کو برایا کی دمبدم محفوظ ۔۔۔ رعایت اس کو رعایا کی رات دن منظور
کسی سیاہ رنگ بجا رہے نہ کوئی باہم دخل ۔۔۔ نہ لے سیاہیِ فلک سے سفیدی کا نور

(۱) سرور یعنی ... (۲) ... کا کل یعنی کا ... (۳) میلِ ... یعنی ... کردن ۱۲ ... ۱۲

لبِ شکایت و فریاد کیوں نہ بند رہیں / مقام امن میں ہیں رات دن وحوش و طیور
بندھے ہیں ایک ہی رسی میں ظلم و فتنہ و شر / کہ روزِ محنۂ انصاف اُس پہ ہے مامور
علوِ جاہ و مراتب میں گرد سے ہے دارا / سموِ شان و جلالت میں ہیچ ہے فغفور
لکھوں وہ مطلعِ رنگیں میں اب سراپا میں / کہ آپ آپ سراپا ہو جس سے ابروئے حور

مطلع

یہ خال و رخ ہے کہ ہے اتصالِ ظلمت و نور / کہ جس طرح ہے بہم ربطِ فلفل و کافور
خدا نے حسن دیا، حسن پر ریاست دی / وہ آفتاب کا جلوہ، یہ ماہتاب کا نور
اسی طرح کا ہے، بلبل ترے گلوں میں تنگ / یونہی ہے سرو میں، قمری، جمالِ قد کا ظہور؟
نمودِ خط نے کیا حسنِ خط کو روز افزوں / جہاں میں دیکھی سواد و بیاضِ دیدۂ حور
صباحتِ رخ و کیفیتِ ملاحتِ خال / بہم ہوئیں، تو بڑھا ذوقِ دیدۂ جمہور
الف ہے بینیٔ روشن مگر امارت کا / یہی الف سرِ اقبال کا ہے تاجِ سرور
حسین، رشکِ قمر، نوجوان، جواں دولت / شجاع، باذلِ دوراں، بلند قدر، غیور
بہائے آبِ گہر آب و تابِ دنداں نے / صدف کا گھر ہوا تاراجِ سیلِ قلزمِ نور
کھلا ہو لعل کہاں لب کے رنگ پر سرسبز / تری نظر کا ہے، اے جوہری صریح قصور
ہوا ہے مطلعِ تازہ کا پھر مجھے سودا / مخاطب اُن سے ہوں باطن میں، ظاہراً ہو دور

مطلع

اگر حضور کو ہو پرورش ذرا منظور / دُرِ یتیم کو ہرگز نہ کوئی دیکھے عور
دکھائیں پانی طلب سے جگا کے روزِ نشاط / اگرچہ طالعِ خفتہ ہو خواب سے مجبور
رہے خیال کرم میں حضور کے جو کوئی / تو اُس کے مطلبِ خاطر نا غیب سے ہو ظہور
دیا ہے آپ کو حق نے وہ دل کہ صورتِ ابر / قریب اُس سے ہے سیراب فیضیاب ہے دور
اگرچہ دور ہوں میں آستانِ دولت سے / مگر حضور کے الطاف کا اگر ہو صدور
مجھے ہو دور قریب اور قرب عزت ہو / رہوں ہمیشہ میں انعام و لطف سے مشکور
اگرچہ مجھ کو ہے مشکل یہ منزلت پانی / کہ مدح خواں ہوں زمانے میں آپ کا مشہور
قلم کو میرے نہیں آج تک یہ راہ ملی / سخن نے میرے نہیں پایا مدح کا دستور(۱)
بندھے ہیں لب مرے، گویا ہے مہرِ خاموشی / ہزار گنجِ سخن اور طبع ہے گنجور(۲)
اشارہ چاہتی ہے طبعِ مدح سنج مری / کہ تا بحشر ہو جس کا جہان میں مذکور
لکھوں وہ مدح کہ جو یادگارِ عالم ہو / پڑھوں قصیدہ وہ جس سے حضور ہوں مسرور
ہوا ہے کیا مجھے کلکِ صفیرِ مدح سرا / نہیں ہے مدح سراؤں کا یہ کہیں دستور(۳)
وہ آفتاب ہے، تو ذرہ کیا ہے مدح تری / مہر تجھ سے ہیں مدحت سرا قریبِ حضور
اگر کرم ہو اُنھیں کا تو ہاں لکھوں میں بھی / کہ تجھ کو نسبت پر اُسی سے ہے کبر و ناز ضرور
لیے آپ دعا کا محل ہے اُٹھا دے دستِ دعا / کہ طبع ہوتی ہے آمین کہنے پہ مامور
یہ آفتاب ہے جب تک فلک پہ جلوہ فروز / یہ ماہتاب ہے جب تک زمیں پہ قاسمِ نور

(۱) بمعنی اجازت - (۲) خزانہ دار ۱۲ (۳) بمعنی قاعدہ و طریقہ ۱۲

رہے حضور کے اقبال کو ترقی روز — بڑھے حضور کی عمر اور جاہ و سور و سرور
الٰہی میری ہی دعا یہ قبول کر لینا — بحق احمد و آلِ رسولِ پاک و طہور (۱)
میری ہو مدح پسندِ طبیعتِ عالی — لکھوں انھیں کی ثنا میں جواب لکھوں میں سطور
پڑھوں مدام قصائد لکھوں دوام ثنا — یہیں ہے مدح سراہوں با بتہاج و سرور
وہ شہر شہر میں مشہور رہوں مرے ممدوح — میں شہر شہر میں مداح اُن کا ہوں مشہور
رہیں وہ مسندِ دولت پہ جلوہ گر دائم — رہوں میں مدح سرائی پہ رات دن مامور

(۳) خواجہ حالی مرحوم، خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ سونی پت کے نہیں۔ جو میرزا صاحب نے سہواً لکھ دیا ہے۔ سنہ ۱۸۳۷ء کے قریب پیدا ہوئے عربی و فارسی کی تحصیل کے ساتھ شعر و سخن کا بھی مشغلہ جاری رکھا۔ میرزا غالب کے قابل فخر شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں، اور نئی طرزِ شاعری کے موجد ہیں۔ یادگارِ غالب حیاتِ جاوید، مسدسِ حالی وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔
یہ عرضی اور قصیدہ ان کے کلیات میں موجود نہیں ہے:
حاشیہ بوسانِ بساطِ فیض مناط، حضرت نواب کیوان جناب، جہانِ مطاع، جہانیانِ تاب دام قبالہ

بموقفِ عرض میرساند

بعدِ گذارشِ مراتبِ عجز و انکسار و تقدیم آدابِ تحیت و تنا موتی چند خارج از آہنگ بری کشد، ہرچند سامعہ خراش است، اما شنیدنی دارد۔ دوش در عالمِ سرخوشی خیال بینی چند بہ تازی زبان در مدحِ بندگانِ حضور ترتیب میداد۔ ناگاہ دلِ سودا زدہ بمنازعت برخاست و گفت: "چیست کہ از چار سو ردی در ہم کشیدہ سرِ نیاز برایں آستانہ فرود آوردہ؟ مگر با ملازمانِ درگاہ سابقۂ معرفتی داشتہ باشی"؟ گفتم: "درمیانۂ شاہ و گدا معرفت چگونہ تواند گنجید؟" گفت، "پس حلقہ کوبی در دولت بچہ نسبت راست آید؟ نشنیدۂ کہ گفتہ اند ؎ در میر و وزیر و سلطان را ÷ بی وسیلت مگرد پیرامن"۔ گفتم: "آنجا کہ کرم عمیم است۔ بیگانہ حکم آشنا دارد"۔ گفت: "یاد دارم کہ پیش از مسند آرائیِ بندگانِ حضور قصیدۂ متضمن مدحِ حضرتِ فردوس مکاں بوساطت بعضی از اعیانِ حسن پور گذارش کردہ و از انجا نویدِ قبولی ہم بتو رسیدہ تا بصلہ و انعام چہ رسد، اکنون بکدام توقع این ہمہ شادمان بودۂ؟" گفتم: "شرمت بادا! مگر آگاہ نۂ از قولِ عرب ؎ کم ترک الاول للآخر"۔ گفت: "نہ ترا فضلی مشہور، نہ ذکری سائر۔ سخن چون تو گمنامی بہ التفات چہ ارزد؟" گفتم: "در مذہب من حرام است ستایش کسی کہ از شہرتِ متکلم بحسنِ کلام وا رسد، و از من قال بما قال پی برد"۔ گفت: "آخر عوضِ این مدیحہ سرائی چہ خواہی؟" گفتم "خواہم آنچہ خواہم"۔ گفت: "از طلبِ مجہولِ مطلق چہ خیزد؟" گفتم: "کار با روشن ضمیری است کہ گفتہ و ناگفتۂ پیشش یکی است"۔ گفت: "نعم، اما از اظہارِ مدعا چہ خلل زاید"؟ گفتم: "سائل را زیان دارد"۔ گفت: "چگونہ؟" گفتم: "ہمتِ ممدوحِ بلند تر از ان است کہ آزردی

(۱) یعنی پاک ۱۲ ضیا ث

سائل بدان تواند رسید۔" گفت: "اگر ہمچنین است، بچہ نوع از بارِ منتِ ممدوح سبکدوش خواہی شد؟" گفتم: "حجتِ این دو مصرع ے شکر بجا آر کہ مہمانِ تو روزیِ خود میخورد از خوانِ تو۔" گفت: "چو در فارسی و اُردو ہم قدرتِ نظم و نثر باندازۂ بایست داشتہ ترا چہ افتاد کہ صعب را بر ذلول اختیار نمودی، و خود را کاوش و دیگران را کاوش بر کاوش افزودی۔" گفتم: "ملاحظۂ فضل و شرفِ ذاتِ ممدوح نگذاشت کہ مکارمِ اخلاقش جز بہ اشرفِ لغات و افضلِ السنہ وصف کردہ شود و فضلِ عربی بر سائرِ السنہ، چنانکہ دانی، محتاجِ بیان نیست۔" القصہ چون سخن بدینجا کشید دل را محلِ گفتگو باقی نماند۔ گفت "این ہمہ کہ گفتی عینِ صواب است۔ اما اگر دعا باندازۂ ہمتِ ممدوح خواہند، چہ جواب خواہی داد؟" گفتم: "بیک بیتِ خود ازین عہدہ بیرون آیم ے

بقدرِ ہمتش نتوان دعا کرد
الٰہی، ہر چہ طبعش خواہد آن باد!

عرضی دعا گو، صفدر الیدین، الطاف حسین، مقیم دہلی متصل حوض قاضی مکان حکیم احسن اللہ خاں

فَاذَا الزَّمَانُ بِمَالِہٖ ۔۔۔ مِنْ جَزْلِہٖ وَزِبَالِہٖ
سَاغَ التَّفَاخُرُ بِالْعُلٰی ۔۔۔ لِشَرِیْفِہٖ وَرُذَالِہٖ
لَزِمَ التَّعَفُّفَ قَانِعًا ۔۔۔ مَنْ کَانَ مِنْ سُؤَّالِہٖ
نَالَ ابْنُ یُوْسُفَ نَوْلَہٗ ۔۔۔ بِالْخَلْقِ دُوْنَ سُؤَالِہٖ
مِطْوَاعُ شَرْعِ الْمُصْطَفٰی ۔۔۔ بِحَرَامِہٖ وَحَلَالِہٖ
لَامَیْلَ فِیْ اَحْکَامِہٖ ۔۔۔ لَامَیْنَ فِیْ اَقْوَالِہٖ
لَاحَجْرَ فِیْ اِنْفَاقِہٖ ۔۔۔ لَاحَصْرَ فِیْ اَمْوَالِہٖ
اَلْحُسْنُ مِنْ اَخْلَاقِہٖ ۔۔۔ وَالْخَیْرُ مِنْ اَفْعَالِہٖ
اَلْفَتْحُ تَحْتَ لِوَائِہٖ ۔۔۔ وَالنَّصْرُ خَلْفَ قِتَالِہٖ
اَلْحَقُّ اِسْمُ قَضَائِہٖ ۔۔۔ وَالصِّدْقُ عَیْنُ مَقَالِہٖ
اِنْ شِئْتَ تَعْرِفُ مَا التُّقٰی ۔۔۔ فَانْظُرْ اِلٰی اَعْمَالِہٖ
اِنْ رُمْتَ تَدْرِیْ مَا الْھُدٰی ۔۔۔ فَارْقُبْ مَبَادِیْ حَالِہٖ
یَنْہِی الْمُنٰی مُتَتَابِعًا ۔۔۔ بِعَطَائِہٖ وَنَوَالِہٖ
بَرٌّ فِی الْعُلٰی مُتَنَاہِیًا ۔۔۔ فِیْ فَضْلِہٖ وَکَمَالِہٖ
یُحْیِی الْوَرٰی وَیُمِیْتُہٗ ۔۔۔ بِجَمَالِہٖ وَجَلَالِہٖ
یُرْوِی الْغَلِیْلَ بِلَفْظِہٖ ۔۔۔ نِعْمَ الرَّوِیُّ فِیْ قَالِہٖ
یَشْفِی الْعَلِیْلَ بِلَحْظِہٖ ۔۔۔ طُوْبٰی لِصَبٍّ وَالِہٖ
بِالْحَدْسِ فَاقَ اُولِی النُّھٰی ۔۔۔ فَامْتَازَ عَنْ اَمْثَالِہٖ
مَا مِنْ مُحَالٍ مُمْکِنٌ ۔۔۔ اِلَّا عَلَی اسْتِدْلَالِہٖ

لا کُلُّ قصدٍ واقعًا — إلّا الّذی فی بالِہ
یغنو ونصرٌ دونها — بیمینِہ وشمالِہ
یُغنی العداۃَ کأنّہ — لا عوذَ من مِرسالِہ
وکأنّما اخلبُ الرّدیٰ — من فوقَ من إرعالِہ
کم طلعۃٍ تجلو الأسیٰ — منها بریقُ جمالِہ
کم لهجۃٍ تشفی الجویٰ — منها هلِلْ یُرٰی مقالِہ
إذ ما یُبارزُ للوغیٰ — فالنّصرُ من عُمّالِہ
ومتیٰ یُفیضُ علی الوریٰ — فاللہُ بانی مالِہ
کم سائلٍ یسطو بہ — ثقۃً بحُسنِ فِعالِہ
لولا الظنونُ معَ الحجیٰ — لا یلبثُ کونَ مِثالِہ
لزمَ العناءُ حسودَہ — لا مرحبًا بِعضالِہ
من لا اراد بقاءَہ — قد جدَّ فی ابسالِہ
یا من کفیٰ أهلَ المُنیٰ — مُتضاعفًا فی فالِہ
قل دلّهتنی فاقۃٌ — رفقًا بحالِ الدّالِہ
لا زلتَ مخدومَ الوریٰ — بمحمّدٍ وبآلِہ

(۳) حکیم فصیح الدین رنج میرٹھ کے باشندے اور قوم کے بنی اسرائیل تھے۔ عربی کی تحصیل کے بعد طب پڑھی اور اسی کو پیشہ بنا لیا۔ شعر و شاعری کا شوق اور میرزا صاحب سے تلمذ تھا۔ شعرای اردو کا ایک تذکرہ، "بہارستانِ ناز"، ان کی تصنیف ہے۔ آقا حسن عرف میرزا صاحب نے توقیعاتِ کسریٰ کا اردو میں ترجمہ کیا اور مہاراجہ سر دگبیجے سنگھ والیِ بلرام پور کی فرمائش پر مطبع جنگ بہادری بلرام پور میں اس کی طباعت ہوئی، تو رنج نے حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

مسرت نے مژدہ سنایا مجھے — کہ احکامِ نوشیروانی چھپا
ہوا سن کے مسرور اور شادماں — دلِ غنچہ ساں، گل صفت کھل گیا
لکھوں اس کے چھپنے کی تاریخ میں — اسی فکر میں تھا میں بیٹھا ہوا
یکایک سنا لب سے ہاتف کے یوں — "یہ نسخہ ہے نوشیروانی سما" ۱۲۸۳ھ

(خمخانہ: ۳، ۵۰۷ و ۵، ۱۴۱ ۲ احکامِ نوشیروانی: ۱۱۷)

قصیدہ در تہنیتِ جشنِ سکندر حشمت، دارا شوکت، فیض رسان، فیاضِ زمان، حاتمِ دوران، نواب کلبِ علی، بہادر دام اقبالہ

آج کل جلتی ہے عالم میں خوشی کی وہ ہوا — آشیاں میں ناچتا ہے طائرِ قبلہ نما
دھوم ہے شادی کی اس غل ہی مبارکباد کا — زیرِ گردوں جابجا بالاے گردوں جابجا
مے سے پر جوبن ہے عروسانہ لباسِ سرخ سے — شورِ قلقل ہے لبِ مینا سے مے پہ قہقہا

لوٹی جاتی ہے ہنسی کے مارے بجلی چرخ پر / ہے بلند آہنگ کوسِ شادمانی رعد کا
ہے نکلتی چھیڑنے سے ناخنِ گلگیر کے / شمع کے رشتے ہیں سازِ تارِ مطرب کی صدا
پھولی پھرتی ہے شفق پہنے ہوئے رنگیں لباس / شادمانی سے جدا گردوں پھرے ہے ناچتا
دیکھیے جس کو وہ ہے مصروفِ سامانِ نشاط / فرشِ سبزہ باغ میں جھولے ہے بادِ صبا
جامِ نرگس ہے کہیں رکھا ہوا گل کے حضور / دخترِ رز ہے لیے شیشۂ مئے انگور کا
سرو ہے مصروفِ سامانِ طرب باندھے کمر / عطرداں کھولے ہوئے بیٹھا کہیں ہے موتیا
شانۂ مرجاں سے سلجھاتی ہے سنبل اپنے بال / یاسمن نے بھی ملا ہے اپنے منہ پہ غالیہ
ابر چھایا مور بولا مور کا سن کر خروش / نشے میں ہے نخلِ بیدِ مجنوں جھومتا
بھر کے پچکاری کہیں فوارہ چھڑکے ہے گلاب / محفلِ گل میں کہیں پنکھا ہلاتی ہے ہوا
نغمہ برلب بلبلِ داؤد الحاں ہے کہیں / ہے کسی تختے میں طاؤسِ نگاریں ناچتا
حق دولے نوابِ عالی جاہ تیری بزم میں / آج ہے ہر بلبلِ تصویر بھی نغمہ سرا
باغ کو دی ہے خبر جا کر جو تیرے جشن کی / لے ہے انعامِ زرِ گل ڈھیریوں بادِ صبا
دیکھ کر جلوہ تری بزمِ طرب کا رات کو / خندہ زن ہیں بزمِ گردوں پر ثریا و سہا
آج وہ دن ہے کہ گردِ کشتیِ مہتاب میں / گوہر انجم کو بھر بھر کر کرے تجھ پر فدا
آئے زہرہ تیری محفل میں دفِ مہر کو لیے / گائے اک ٹھا کھڑے ہو کر مبارکباد کا
کیوں نہ ہو خورشید کا چرخِ چہارم پر دماغ / آفتابہ ہر سحر لے منہ دھلاتا ہے ترا
غیر ممکن تیری خواہش سے ہو ممکن بالیقیں / سنگ موتی دے تجھے اور سیپ لعلِ بے بہا
دین کو اللہ اکبر، کیا دیا تم نے رواج! / نکلے ہے ناقوس سے اللہ اکبر کی صدا
زلفِ محبوباں کو بھی کافر نہیں لکھتا کوئی / کفر یاں تک رعبِ دینداری نے تیری کھو دیا
مہ جبینوں کو عرق تیری جبیں کا عطر ہے / سرمۂ چشمِ اولی الابصار تیری خاکِ پا
میر فرش فرشِ رنگیں آفتاب و ماہتاب / چرخ رنگیں فرشِ رنگیں ہے ترے دربار کا
عدل گستر تو یہاں تک ہے کہ تیرے دور میں / غیر ممکن ہے کہ پانی آگ کو دیوے بجھا
خوف سے تیرے غضب کے یاں تلک ہے انتظام / گھاس کے تنکوں کو بھی آتش نہیں سکتی جلا
گر یہی ہے عدل فرمائی تو تیرے دور میں / دانے کو بے جرم پیسے گی نہ ہرگز آسیا
یاں تلک آرام تیرے نظم سے ہر اک کو ہے / پاؤں پھیلائے ہوئے فتنہ بھی سوتا ہے پڑا
کیا بیاں کیجے تری دریا دلی، بحرِ کرم / موتیوں سے دامنِ امیدِ دریا بھر دیا
خستگانِ غم کو ہے تیری نگہ حرزِ اماں / دلِ شکستہ کو ترا دستِ کرم ہے مومیا
سلطنت سے بھی ہے افزوں ور کی دربار ترے / سایۂ دامن ہے تیرا سایۂ بالِ ہما
ہے خوشی ذرہ سے تا خورشید تیرے جشن کی / ہے نشاط اندوز عالم میں ہر اک چھوٹا بڑا
جاہ و منصب عمر و دولت روز افزوں ہو نصیب / جشنِ جمشیدی سے ہر دن جشن ہو تیرا سوا
تجھ سے گر چاہوں نہ دادِ شعر تو اے قدرداں / قدرداں تیرے سوا اب کون باقی رہ گیا
رنج کے ہاتھوں سے دل کا رنج کے یہ حال ہے / جس طرح ہو دانۂ انگور مرجھایا ہوا
جشنِ شاہانہ مبارک تجھ کو با اقبال و عمر / عمر بھی وہ ہو کہ جس کی کچھ نہ ہووے انتہا

از طرف عقیدت آگیں، خاکسار راہ آل محمد نصیح الدین بن اسرار ابن المتخلص بہ رنج متوطن شہر میرٹھ

(۴) اس خط کے دوسرے پیرے کے الفاظ "اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں" اور اس خط کے جواب کا طالب غالب۔ ۱۱ جون" میرزا صاحب کے قلم کے نوشتہ ہیں، اسی لیے اس خط کے بقیہ حصے میں متعدد املائی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ "پہنچے" کو کاتب نے دونوں جگہ "پونچے" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اس متن میں اصلی حالہ باقی رکھ کر اپنے خط میں اپنے قلم سے "پہنچے" بنا دیا ہے۔ جو اس کا املا کاتب نے ہائے ہوز سے لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اس کو قلم زد کر کے حائے حطی سے لکھا ہے۔

(۵) میرزا صاحب کے خط میں یہ لفظ موجود نہیں ہے، لیکن سیاق چاہتا تھا اس لیے میں نے اس کو سہو کاتب و مکتوب نگار خیال کر کے اضافہ کر دیا ہے۔

(۶) احسان حسین خاں اور مظفر حسین خاں کے لئے عریضہ ۱۱ کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

(۷) اصل خط میں "ہے" بصیغہ مفرد تحریر ہے۔ لیکن اصول زبان کی رو سے دیکھا صیغہ جمع ہونا چاہیے۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ اس پر میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی متن میں "ہیں" لکھ دیا ہے

(۸) خط کے لفافے پر مہر منشی صاحب کی حسب ذیل تحریر ہے "۸۱ خط در جواب نوشتہ شد ۲۱ صفر سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۲۱ جون سنہ ۱۸۶۷ء" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے خط کی پوری تاریخ ۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷ء ہے یہ بھی صحیح کر دینا ضروری ہے کہ خط کشیدہ الفاظ میرزا صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۹) یہ لفظ اصل میں ساقط تھا میں نے اس لیے بڑھا دیا ہے کہ جملہ درست ہو جائے۔

صفحہ ۱۱۳

(۱) یہ عریضہ بھی میرزا صاحب کے اپنے قلم کا نوشتہ نہیں ہے۔ البتہ خط کشیدہ عبارتیں انھوں نے اپنے قلم سے بڑھائی ہیں۔

(۲) اس خط کے لفافے پہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء تاریخ درج ہے۔

صفحہ ۱۱۵

(۱) میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبدالحکیم خاں صاحب مدرس فارسی مدرسہ عالیہ رامپور سے مبلغ ۲۵ روپے میں خریدا گیا تھا۔ خیال تھا کہ سبین فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقہ بھی موصوف الذکر بزرگ کے پاس ہوگا، لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہو سکا۔

(۲) عرفی کے لیے عریضے ۱۶ کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

(۳) جلال الدین اکبر ابن نصیر الدین ہمایوں، ابن ظہیر الدین بابر، سلطنت مغلیہ کا تیسرا اور شاید عظیم ترین بادشاہ تھا۔ امر کوٹ (سندھ) میں سنہ ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) کو پیدا ہوا۔ ابھی تیرہ سال نو مہینے کی عمر تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیرم خاں خانخاناں نے اسے بادشاہ بنا کر خود صدر اعظم کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ لیکن اپنی خداداد قابلیت سے اکبر نے بہت جلد انتظام سلطنت کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور سلطنت مغلیہ کی حدود کو گجرات، بنگال، کشمیر اور سندھ تک وسیع کر دیا۔ فتح پور سیکری اسی نے آباد کیا تھا یہ بہت شوقین کپڑا اٹھاتا تھا لیکن ایک دانشمند بادشاہ کی طرح دربار کو اس وقت کے ممتاز اہل علم سے مزین رکھتا، اور ان کے

علمی مباحثوں میں شریک ہوتا رہتا تھا جس سے اس کی معلومات اور قابلیت میں غیرمعمولی
وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے دربار کے نورتن اب تک مشہور رہیں۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ
دین الٰہی کی ترویج ہے جو خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے بیحد مضر، مگر خود اس کی سیاست ملکی میں
بہت معاون ثابت ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی پرشور فضا اسی مذہب کی بدولت جنت نشان بنی
تھی۔ اکبر نے جمادی الآخرہ سنہ ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) کو ۶۳ سال کی عمر میں اس دار فانی کو خیرباد کہا۔

(۴) ابوالفضل، شیخ مبارک کا بیٹا اور فیضی کا بھائی ہے۔ یہ سنہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا۔
سنہ ۹۸۱ اکبر شاہی میں ملازمت کا شرف حاصل کیا، اور بہت تھوڑے عرصہ میں وزارت کے درجے تک
جا پہنچا۔ اس کو ربیع الاول سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں شاہزادہ سلیم کے ایما سے ۵۲ سال ۲ ماہ کی عمر میں
شہید کر دیا گیا۔ یہ بڑا مدبر اور زبردست ادیب تھا۔ آئین اکبری، اکبرنامہ اور مکاتبات علامی اس کی
تصنیفات ہیں۔ شعر بھی کہتا اور علامی تخلص کرتا تھا۔ یہ اکبری دربار کے نورتن میں شمار کیا جاتا
ہے۔ اس کے قتل کی اطلاع سے اکبر کو اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ اس نے کئی وقت کھانا نہ کھایا۔
اور بار بار کہتا کہ اگر شیخو بابا مجھے قتل کر دیتا تو اس سے بہتر تھا۔

(۵) فیضی، شیخ مبارک کا بڑا بیٹا، اور اکبری دربار کا ملک الشعرا تھا۔ حکمت، فلسفہ، ریاضیات،
تاریخ اور سنسکرت کا عالم تھا۔ سواطع الالہام، اور موارد الکلم، عربی میں، اور کلیات، نل دمن
اور خمسہ، اور ترجمہ لیلاوتی فارسی میں اس کی مشہور تصنیفات ہیں۔ یہ ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ھ
(۱۵۹۵ء) کو ۵۰ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

(۶) اصل میں نون ساقط ہے چونکہ میرزا صاحب نے ہمیشہ اس لفظ کو نون کے ساتھ لکھا ہے،
اس لیے متن کے اندر نون کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۷) حکیم ابوالفتح مسیح الدین ابن حکیم عبدالرزاق گیلانی اکبر کا طبیب خاص اور اس عہد کا
بڑا فاضل تھا۔ یہ اپنی علمی وجاہت و عظمت کے سبب سے بادشاہ کے دربار میں ممتاز
درجے کا مالک اور نورتن میں شامل تھا۔ اس نے سنہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۸ء) میں وفات پائی۔

صفحہ ۱۱

(۱) میرزا صاحب نے پتا اس طرح لکھا ہے "در رامپور آزاد خاں کا تکیہ، دبدبۂ سکندری کا مطبع، محمد حسین
خاں مالک مطبع"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مطبع کا نام "حسنی" اور مالک مولوی محمد حسن خاں تھے، لہٰذا

(۲) مطبع حسنی مراد ہے۔ مولوی محمد حسن خاں صاحب نے سنہ ۱۸۶۶ء میں اسے جاری کیا تھا۔

(۳) ڈگ بجے سنگھ، بلرامپور کے زمیندار تھے۔ غدر کے پرآشوب ایام میں انگریزوں کی خدمات
جانبازی سے انجام دیں، جن کے صلے میں تلسی پور کا سارا پرگنہ جو ضبطی میں آ چکا تھا،
گورنمنٹ نے عطا کر دیا، اور ضلع بہرائچ میں بھی ایک بڑا علاقہ مرحمت کیا۔ اس
کے علاوہ جملہ موروثی علاقے میں دس فی صدی جمع سرکاری معاف اور مرفوع القلم
کر دی گئی۔ ڈگ بجے سنگھ جو عدالت ہای دیوانی کی حاضری سے مستثنیٰ ہوئے، اور ان کے
پانسو ہمراہی ایکٹ اسلحہ کے اثر سے بری قرار پائے۔ نیز انہیں مہاراجہ بہادر اور
کے سی ایس آئی کا خطاب بھی ملا، اور ۹ ضرب توپ کی سلامی کا اعزاز حاصل
ہوا۔ کچھ عرصے کے لیے ویسرائی کی مجلس وضع قوانین کے رکن بھی رہے۔